فائزہ افتخار

اے میری زہرہ جبیں

میں ایک شریف شوہر ہوں۔

اور میرا خیال ہے ننانوے فیصد شوہر شریف ہی ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ کوئی ان کی شرافت کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔

اور یہ بھی ایک الگ ہی معاملہ ہے کہ ان ننانوے فیصد شوہروں کی شرافت کی بھی تقریباً ننانوے اقسام ہوتی ہیں۔ ہر قسم کا ہر طرح کا شریف شوہر۔۔۔۔

جیسے کہ کچھ مرد "بنیادی" طور پر شریف ہوتے ہیں۔

یہ شریف شوہروں کی وہ قسم ہے، جس میں شوہر حضرات اپنی شادی شدہ زندگی کی بنیاد ہی شرافت پہ رکھتے ہیں گویا اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کے باہر تمام تر رعنائیوں، خوبصورتیوں کے لیے "نو انٹری" کا بورڈ لگا دیتے ہیں۔

کچھ مرد "فطری" طور پہ شریف ہوتے ہیں۔

ایسے شوہروں کی تعداد بے حد کم ہوتی ہے، اس لیے نہیں کہ دنیا میں پیدائشی اور فطری طور پر شریف انسان بہت کم ہیں۔ بلکہ اس لیے ان میں سے گنتی کے چند ایک ہی ہوتے ہیں جن کو شوہر کے درجے تک پہنچنا نصیب ہوتا ہے۔ ان کی شرافت کے ڈنکے پہلے ہی اتنی دور دور تک بج چکے ہوتے ہیں کہ عقل مند مائیں اپنی بیٹیوں کو ان کی قدرتی شرافت کی بھینٹ

ناولٹ

چڑھانے کے بجائے گھر بٹھانا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

اور ایک ہوتے ہیں تجرباتی قسم کے شریف شوہر۔ جیسے کوئی تو سو چوہے کھا کے حج کو جاتا ہے' اسی طرح کچھ مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جو کئی سالوں تک کامیابی سے زمانے بھر میں "آنی پانے" کے بعد شادی کرکے شرافت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔

ایک قسم ہوتی ہے حادثاتی قسم کے شریف شوہروں کی اور ایک ہوتے ہیں معجزاتی شریف شوہر۔ ویسے تو یہ لسٹ خاصی لمبی ہوتی چلی جائے گی اور آپ بھی اس زبانی کلامی تشریح سے مطمئن ہونے والے نہیں۔ کیوں نہ آپ سب کا تعارف ان تمام اقسام کے شوہر حضرات سے کرا دیا جائے۔ دور کیوں جایئے' میں اپنے حلقے سے یہ تعارف شروع کرتا ہوں۔

ہمارا چار کا ٹولہ کالج کے زمانے سے مشہور ہے۔ ہر دور میں اس شہرت کی وجہ اور رہی ہے۔ آج کل ہم چاروں "شریف شوہروں" کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

کس قسم کے شریف۔۔۔؟

یہ آپ اب جان لیں گے۔

جیسے ہم چاروں کا ٹولہ مشہور ہے' اسی طرح ان چاروں کی ٹولی۔ آیئے ایک "جھاتی" ادھر بھی مارتے ہیں۔

وہ چار۔۔۔ یعنی ہم چار یاروں کی گھر والیاں۔۔۔ نصف بہترین۔۔۔ (بہتر کی جمع بہترین ہی ہوتا ہے نا؟)

"میرا صرف نام ہی نہیں بلکہ خطاب بھی "مجاہدہ" ہونا چاہیے۔" یہ مطالبہ مجاہدہ کر رہی تھی۔ مجاہدہ' نعمان کی بیوی۔

"نعمان جیسے شخص کے ساتھ عمر کے نو سال گزار لینا کسی جہاد مسلسل سے کم نہیں۔ یہ خطاب میرا حق ہے۔"

"نو سال اور گزار لو تو مجاہدہ کا ہی نہیں "شہید" کا خطاب بھی مل جائے گا۔" زوبا نے پکارا۔۔۔ وہ ان میں

میں سب سے کم عمر اور سب سے زیادہ خوش مزاج تھی۔

"ہاں ہاں' تم تو چہکو گی ہی۔۔۔ پیر دھو دھو کے پینے والا شوہر جو ملا ہوا ہے۔" رشک و حسد سے بھرپور وار حمیرا نے کیا تھا۔ حمیرا میری بیوی۔

"ہائے نہیں' پلیز ایسا تو نہ کہیں۔" زوبا نے مصنوعی معصومیت سے پلکیں پٹپٹائیں۔ "یہ پیر دھو کے پینے والی اصطلاح مجھے سخت زہر لگتی ہے۔ غیر انسانی اور بہت ہی تذلیل بھری۔"

"ہاں' غیر انسانی اور بہت ہی تذلیل بھری۔" مجاہدہ نے حمیرا کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ "بالکل اس طرز عمل جیسی جو یہ پرکٹی اپنے شوہر کے ساتھ روا رکھتی ہے۔"

"تم بہت چپ چپ ہو فاطمہ؟"

"ارے نہیں۔۔۔ بس یونہی۔۔۔ لو چائے آگئی۔"

اس وقت وہ میزبان تھی' باقی تین اپنے اپنے میاؤں کے ساتھ اس کے گھر مدعو تھیں۔

مجاہدہ نے ایک ٹٹولتی ہوئی نظر چائے لے کے آنے والی نو عمر ملازمہ پہ ڈالی۔ کھانا فاطمہ نے خود تیار کیا تھا' البتہ سرو کرنے میں باقی تینوں نے بھی مدد کی تھی۔ تب یہ ملازمہ نہیں آئی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے برتن دھونے آئی تھی اور فاطمہ چائے دم لگانے کے بعد اسے ٹرے میں رکھ کے لانے کا کہہ کے آئی تھی۔

"ڈرائنگ روم میں دے آئی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں بی بی جی' بس جا ہی رہی ہوں۔ وہ دوسرا بھی تیار کر کے رکھا ہے۔" اس کی آواز بھی بڑی کھنکتی ہوئی سی تھی۔ اب وہ گھٹنوں کے بل کارپٹ پہ بیٹھی پیالیوں میں چائے ڈال رہی تھی۔

مجاہدہ نے ذرا اور تفصیلی جائزہ لیا۔ ساتھ ہی حمیرا کو بھی کہنی ماری۔

سترہ اٹھارہ سالہ چھنو سانولے رنگ کی تیکھے نقوش والی پھرتیلی سی لڑکی تھی' جسم دبلا پتلا مگر قد لمبا تھا۔ فاطمہ ہی کے پرانے ڈارک گرین لان کے سوٹ کی ہاف سلیو

شرٹ میں سے اس کے بھرے بھرے بازو بڑے سڈول لگ رہے تھے۔ گول کلائیوں میں تتلی کی چھ سات سیاہ کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ لمبی لمبی انگلیوں میں کانچ کے رنگ برنگے سستے سے چھلے۔۔۔ کھڑی ناک میں چاندی کی لونگ۔۔۔ کانوں میں لمبے لمبے جھولتے ہوئے ٹوپز۔۔۔ اچھی خاصی "تفریح" فاطمہ نے گھر میں رکھ چھوڑی تھی۔

اسی خیال کا اظہار مجاہدہ نے حمیرا کے کان میں کیا۔

"سنو' ڈرائنگ روم میں بس ٹرے رکھ کے آجانا۔" مجاہدہ نے آرڈر دیا۔

"مگر جی۔۔۔ صاحب لوگ۔۔۔!" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مجاہدہ نے دوبارہ ٹوک دیا۔

"ہمارے مرد عادی ہیں اپنی مدد آپ کے' تم سے زیادہ اچھی طرح چائے بنا لیں گے۔"

"توبہ۔۔۔ یہ کیا چیز رکھ لی تم نے فاطمہ! کوئی عقل نام کی چیز ہے کہ نہیں۔" اس کے جانے کے بعد وہ اسے لتاڑنے لگی۔

"تو میں نے کیا کیا ہے؟" فاطمہ حیران ہوئی۔

"اچھا بھلا چلتا پھرتا فتنہ گھر میں گھسا لیا ہے' کہاں سے لی یہ چھمک چھلو؟"

"کون۔۔۔ یہ چھنو؟ ہماری پرانی ملازمہ کی ہی بیٹی ہے۔ وہ بوڑھی ہو گئی ہے بے چاری' کام نہیں کر سکتی' اس لیے اسے بھیج دیا ہے۔"

"تمہارا گھر اجاڑنے؟"

"کیا مطلب؟" فاطمہ برا مان گئی۔ "چھنو بے چاری غریب لڑکی ہے اور شریف بھی۔"

"نہ وہ غریب نظر آرہی ہے نہ شریف' دوپٹہ کیسے گلے میں ڈال رکھا تھا اور کانوں میں دیکھا تھا' کیا لٹکا رکھا تھا۔۔۔ موتیوں سے بھرا ایئر رنگ' ہونہہ خود کو "کشش" کہہ رہی تھی۔ صدیق بھائی کو بچا کر رکھنا اس قیامت سے۔"

"توبہ کرو' وہ بے چارے تو آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے۔" فاطمہ کا مسئلہ یہ تھا کہ اسے سارا زمانہ "بے

چارہ" لگتا تھا۔

اور مجاہدہ کا مسئلہ یہ کہ اسے ہر کوئی "فسادی" نظر آتا تھا۔

"ہاں' نیچی آنکھ سے بھی خوب نظارے ہو جاتے ہوں گے پھر نظر اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے بھرپور طنز کیا پھر حمیرا اور زوبا کو ٹہوکا دیا۔

"بھئی اب فاطمہ کے ہاں چوکس ہو کے آنا پڑے گا۔ اس کی نظر میں تو ہر مرد "بے چارہ" ہے' لیکن میری نظر سے دیکھو تو ہر مرد کے لیے یہاں چھنو کی صورت میں "چارہ" ہے۔"

"واہ بھئی' شاعری۔۔۔" زوبا کی ہنسی حسب عادت بے قابو ہو کے بکھر گئی۔

"ہنس لو' بے شک ہنس لو مگر ساتھ ہی میری یہ بات بھی لکھ لو۔ اب ہم تینوں کے "میاؤں" ہر دوسرے دن "چلو صدیق کی طرف چلیں" کی رٹ پکڑے ہوں گے۔"

اس نے چوکنا کرنا چاہا۔ زوبا نے تو ہمیشہ کی طرح بات ہنسی میں اڑا دی' البتہ حمیرا۔۔۔ میری حمیرا کو وہ متوحش کرنے میں ضرور کامیاب ہو گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

آج ہم سب صدیق کے گھر اکٹھے ہوئے تھے۔ اتوار کا دن تھا اور ہر مہینے کا آخری اتوار ہم چاروں کسی ایک گھر پہ اکٹھے ہو کے گزارتے ہیں۔ ناشتے کے فوراً بعد اکٹھے ہونا۔۔۔ دوپہر کا کھانا مل کے کھانا' ساری دوپہر گپ شپ میں گزارنا اور شام کی چائے پی کے اپنے اپنے گھر روانگی۔ سالوں سے یہ ہمارا معمول ہے۔

آج صدیق کی باری تھی' صدیق یاجوج۔

عمر اڑتیس سال' قد پانچ فٹ گیارہ انچ' رنگ۔۔۔ اوں۔۔۔ کیا واہیات رنگ ہے یار! نام ہی نہیں سوجھ رہا کہ کیا کہوں۔ سانولا کہوں یا گندمی۔۔۔ ہاں مٹیالا' یہ صحیح ہے۔ بال۔۔۔ تقریباً فارغ البال۔ پیشہ' ایک سرکاری محکمے میں معقول ملازمت' معاشی حیثیت' اوپر کی آمدنی

اور نیچے کی آمدنی (ٹیبل کے نیچے سے لی گئی) کو ملا کے ٹھیک ٹھاک حیثیت ہو چکی ہے۔ ازدواجی حیثیت' شادی کو تیرہ سال ہو چکے ہیں' چار بچے۔۔۔ عمریں بالترتیب بارہ سالہ بیٹی' دس سالہ بیٹا اور پھر ایک نو سالہ اور ایک پانچ سالہ بیٹیاں۔ شریکِ حیات فاطمہ صدیق۔۔۔ عمر اللہ ہی جانے' تعلیم ایف اے (بقول ان کے) مزاج سنجیدگی کی جانب مائل' کم گو مگر مہمان نواز اور بامروت۔ دونوں کی مشترکہ گاڑی پچھلے تیرہ سال سے کامیابی کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پہ گامزن تھی۔ ہم چاروں دوستوں میں سب سے پہلے شادی شدہ ہونے کا اعزاز بھی اُسے ہی حاصل ہوا تھا۔

اب ایک نظر صدیق کی غیر شادی شدہ زندگی پہ بھی ڈال لی جائے۔ میں ذرا حافظے کے اوراق الٹ کے دیکھتا ہوں۔

"اوں۔۔۔ ہوں۔۔۔ کس قدر بور' ڈل۔۔۔ روکھی پھیکی زندگی۔ لے دے کے بس ایک اکلوتا خاندانی عشق۔

خاندانی عشق سے میری مراد ہے' خاندان ہی کی کسی ایسی لڑکی سے جس سے اظہار کی جرأت تک نہ ہو سکی میرے یار کو۔ موصوفہ ان کے کسی دور پار کے چچا کی صاحبزادی تھیں اور ان چچا کا ان کے والد سے کوئی پرانا حساب کتاب نکلتا تھا۔ اپنا یار ٹھہرا ذرا کم ہمت قسم کا بندہ۔ اس نے یہ کھڑاگ ہی نہ پالا۔۔۔ نہ عشق کی پتنگ کو ڈھیل دی۔۔۔ نہ اس نے اڑان بھری۔۔۔ نہ بو کاٹا ہو کے اس حسینہ کی چھت پہ گری۔۔۔ نہ اس کا ابا اس کے ابا کو طعنہ دینے آیا۔۔۔ مشکل کاموں میں یہ ہاتھ نہیں ڈالتا۔ یہ صدیق باجوہ کا مزید تعارف ہے۔

البتہ اپنی بیوی فاطمہ سے عشق اس نے خوب دھواں دار کیا۔ شادی سے ایک دن پہلے تک۔۔۔ حتیٰ کہ مہندی والے دن تک تو وہ اپنے ناکام ادھورے عشق کے غم سے نڈھال تھا۔

"یار! اگر وہ کل میرے گھوڑے کی باگ تھام کر "واگ پھڑائی" کا مطالبہ کر بیٹھی تو یہ غم میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔"

اس نے میرے کاندھے پہ سر رکھ کے اپنا دکھڑا رویا۔ اس کی سگی بہن تو کوئی تھی نہیں' خدشہ تھا کہ رشتے کی بہنیں یہ رسم پوری کر کے اپنے ارمان نکالیں گی۔

"اب تمہاری شادی کسی اور سے ہو رہی ہے۔ وہ تمہیں بھائی جان کہے یا کل کو اس کے بچے تمہیں ماموں جان۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"پڑتا ہے' فرق تو پڑتا ہے میرے دوست! جس کو میں "منہ دکھائی" دینے کا ارمان رکھتا تھا' اسے "واگ پھڑائی" دینا بہت مشکل ہو گا۔"

مگر گھوڑی چڑھنے کے بعد سارے مراحل ایک ایک کر کے آسان ہوتے چلے گئے۔ نکاح نامے پہ دستخط کرنے کے بعد میری مبارکباد وصول کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ اچانک اس نے اپنی پرانی محبت کا ہر نشان دل سے کھرچ ڈالا ہے۔

"نئی زندگی میں داخل ہونے کی پہلی شرط دیانت داری ہے۔ میں سنتِ نبوی پر عمل کرنے جا رہا ہوں۔ تم بھی بھول جانا کہ کبھی میں نے کسی سے محبت کی تھی۔ "کل" گزر چکا ہے اور میرا "آج" ہی میرا سب کچھ ہے۔"

گھونگھٹ اٹھاتے ہی وہ گوڈے گوڈے فاطمہ بھابھی کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔ اب ان چاروں میں وہ واحد تھا جو ایک عدد بیوی کا شوہر ہو چکا تھا۔ ہم سب کی عمریں ایسی تھیں جہاں شادی کا لفظ ابھی ہمارے کانوں میں صرف شہنائیاں بجایا کرتا تھا' فی الحال خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع نہ ہوئی تھیں۔ اس کے خوشگوار ازدواجی زندگی کے قصے سن سن کر ہم لوگ شادی کو ایک رومانٹک فینٹاسی خیال کرنے لگے تھے۔

اس کی یہ دیانت داری' دیوانگی اور وفا شعاری شادی کے تیرہ برس بعد بھی کم نہ ہوئی تھی تو خود اندازہ لگائیے تیرہ برس قبل کیا حال ہو گا جناب صدیق باجوہ صاحب

کا۔ اور کوئی عورت ہوتی تو اتنی پذیرائی پا کے پھولے نہ سماتی' سر پہ چڑھ کے ناچنے ہی لگتی مگر فاطمہ بھابھی بہت سلجھی ہوئی خاتون ثابت ہوئیں۔ انہوں نے صدیق کی اطاعت گزاری کا ناجائز فائدہ کبھی نہیں اٹھایا۔

اس کے دلفریب قصے سن سن کر رشک تو ہم سب کرتے تھے۔ دل ہی دل میں شادی کر گزرنے کی خواہش بھی چٹکی لینے لگی تھی مگر سب سے پہلے جو شخص پھسلا' وہ تھا نعمان علی۔

☼ ☼ ☼

نعمان علی۔

عمر اڑتیس سال۔۔۔ قد چھ فٹ دو انچ' رنگ صاف (جو کسی زمانے میں گورا بھی کہلایا جاتا تھا مگر اب حالات کی جھلستی لو کے تھپیڑوں نے اسے گہرا کر دیا تھا) بال ڈارک براؤن (جو کبھی گھنے بھی ہوا کرتے تھے' ماتھے پہ گرتی لٹوں کو جب وہ ایک جھٹکے سے پرے کر کے تیز تیز لہجے میں باتیں کرتا تھا تو آس پاس سے گزرنے والی لڑکیاں پٹاپٹ اس پہ نثار ہو جایا کرتیں) آنکھیں لائٹ

براؤن بے حد سحر انگیز' اور ان آنکھوں کی حد تک یہ دلکشی اب تک برقرار تھی۔ رنگ بے شک سفید سے گندمی ہو گیا تھا اور بال بھی اچھے خاصے کم ہو چکے تھے' مگر یہ بھوری آنکھیں اور چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد وہی تھا جو کبھی صنفِ نازک کے لیے بے حد کشش کا حامل تھا۔

پیشہ' بینک کی ملازمت' معاشی حیثیت' لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والا یہ شخص اپنی اعلا تعلیم کی بدولت اچھے عہدے کی ملازمت پا کے اپر مڈل کلاس تک ترقی کر چکا تھا' اوپر سے جوڑ کے رکھنے کی بھی عادت تھی' اسی لیے حالات ٹھیک ٹھاک تھے۔

ازدواجی حیثیت۔۔۔ بارہ سال سے شادی شدہ۔

بچے' دو ہی اچھے۔۔۔ ایک لڑکا' ایک لڑکی۔ عمریں بالترتیب دس اور سات برس۔

بیوی مجاہدہ۔ جو "مردِ مجاہد" کے تمام اصولوں پہ پوری اترتی ہے۔ ہمہ وقت سر پہ کفن باندھے' ہاتھ میں ننگی تلوار لیے اور ترکش میں خوب اچھی طرح تراشے ہوئے طعنے تشنوں کے تیر رکھے' وہ چوبیس گھنٹے نعمان کی خبر گیری کے لیے تیار رہتی تھی۔ وجہ تھی' نعمان علی کی شہرت۔۔۔

اور شہرت ان کارناموں کی تھی جو لاتعداد تھے' بے شمار تھے اور نعمان علی نے اپنی بیچلر لائف میں ملک کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے شہر کے اندر "مچا" رکھے تھے۔

اپنے زمانے میں نعمان بڑا گبھرو ہوا کرتا تھا' لڑکیاں گھیرنے کا فن اسے بخوبی آتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون سا پرفیوم لگاتا تھا' کوئی جادو کا منتر پڑھ کے پھونک رکھا تھا اس پہ شاید۔۔۔ جو وہ جہاں سے گزرتا' دو چار لڑکیاں تو ضرور اس پہ فدا ہو جاتیں۔ اپنی اس خداداد صلاحیت سے اس نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ ہم لوگ اس کی وجاہت پہ رشک کرتے تھے تو اس کی صنفِ نازک میں مقبولیت سے حسد بھی کرتے تھے۔

ایک صدیق تھا' بے چارہ گونگی محبت میں ہی ناکام ہو کے مشرقی بیٹے لڑکوں کی طرح ماں باپ کی پسند کی ہوئی لڑکی سے وفا نبھا رہا تھا۔

دوسرا میں جسے لڑکی تو ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی دل کو بھا جاتی مگر اگلے مراحل طے کرنے سے ڈرتا تھا۔ لڑکی کی سینڈل سے اتنا ڈر نہیں لگتا تھا جتنا اس کے بھائی کی پشاوری چپل اور ابا کی چھڑی سے۔ اپنے اوپر اتنا اعتماد تو تھا کہ اتنا گیا گزرا نہیں کہ کوئی لڑکی گھاس نہ ڈالے۔ لیکن اگر یہ گھاس کھاتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔ تو کیا ہوگا؟ بس یہ سوال مجھے ایک حد کے اندر رکھتا تھا۔ دوستوں، یاروں کے ساتھ مل کے موج مستی کر لینا اور بات ہے مگر تن تنہا اپنے نازک شانوں پہ کسی عاشقانے کا بوجھ لادنا ایک الگ بات۔

تیسرا رجب تھا۔ ویسے ہی صنفِ نازک سے پرہیز تھا۔ مولوی ٹائپ بندہ تھا۔ ظاہر سے نہیں بلکہ باطن سے۔ ایسے میں نعمان علی کو ہمارے ٹولے کے ہیرو کی حیثیت حاصل تھی۔

ہر روز ایک نیا یارانہ۔۔۔

تحفے تحائف کا تبادلہ۔۔۔ جو زیادہ تر لیے ہی جاتے اپنا حق جان کر، دینے کی نوبت کم ہی آتی۔ کبھی دیتا بھی تو اپنی جیب، اوقات اور چڑیا سے دل کے مطابق۔۔۔ کبھی دس روپے درجن ملنے والی عام سی چوڑیوں کا سیٹ۔۔۔ کبھی راستے سے توڑا ہوا کوئی پھول وغیرہ وغیرہ۔۔۔ جبکہ اسے ملنے والے پرفیوم، رسٹ واچ، ٹی شرٹس جنہیں وہ سب میں دکھا دکھا کے شو مارا کرتا۔ یہی شو بازی اُسے لے ڈوبی۔

مجاہدہ اس کی فرسٹ کزن تھی۔ کالج کی طرح فیملی میں بھی اس کی شہرت پھیل چکی تھی۔ مجاہدہ بھی شادی سے پہلے دوسری ٹین ایج لڑکیوں کی طرح اپنے اس وجیہہ کزن پہ چپکے چپکے مرا کرتی تھی، مگر اس سے شادی کی خبر نے اس کی سٹی گم کرکے رکھ دی۔ بہت روئی دھوئی، شور مچایا مگر اس کے ماں باپ نے اسے نعمان کے پلے باندھ کے ہی دم لیا۔ آخر اس سے چھوٹی تین بھی بیٹھی تھیں۔ سب نے یہی سمجھایا کہ لڑکے کنوارپن میں یونہی منہ ماری کیا کرتے ہیں، کھونٹے سے بندھنے کی دیر ہوتی ہے سب بھول بھال جاتے ہیں مگر مجاہدہ کا خیال تھا کہ مرد اور کولہو کے بیل میں فرق ہوتا ہے، وہ وحشی ضرور ہوتا ہے مگر بے زبان جانور نہیں کہ آسانی سے ایک کھونٹے سے بندھا رہے۔ یہ خیال اس کے ذہن میں کچھ اس طرح پختہ ہوا کہ شادی کے بارہ سال بعد بھی نعمان کا بے داغ ریکارڈ تک اسے متاثر نہ کر سکا۔

”مرد چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔“ یہ اس کا ترمیم شدہ قول تھا جس کی وجہ سے نعمان بے چارے پہ زندگی سخت ہو چکی تھی۔ ہر وقت شک۔۔۔ ہر وقت سوال۔۔۔ تنگ آچکا تھا وہ، کبھی کبھی تو ہم اسے اُکساتے۔

”شامت تو تیری آئی ہی رہتی ہے یار۔ کیوں نہیں تو بھابھی کی بات کو سچ ثابت کر دیتا۔ انہیں بھی تو پتہ چلے کہ جو مرد گھر سے باہر دلچسپی رکھتے ہیں ان کی بیویاں یوں عیش نہیں کرتی پھرتیں۔“

”بس یار! اب دل نہیں مانتا۔“ وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ معذوری ظاہر کرتا۔

صدیق کا خیال تھا کہ وہ ”بنتا“ ہے، جبکہ میرا تجزیہ تھا کہ وہ فطرتاً ”بنیا“ ہے، چار پیسے خرچ کرتے اس کی جان نکلتی ہے۔

”بھئی اب وہ بائیس چوبیس سالہ نعمان تو رہا نہیں کہ اس کی محبوبائیں اس کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کرنے کے لیے اپنی پاکٹ منی سے بچا بچا کے اس کے لیے قیمتی تحائف خریدیں۔ شادی شدہ مرد اگر ”محبوبہ“ افورڈ کرتا ہے تو اپنی جیب کے بل بوتے پہ۔ اب لینے والے زمانے لد گئے، دینے والی عمر ہے اور دینا اس کو ہے نہیں۔ پائی پائی جمع کرنے کی عادت جو ہے۔“

”کہاں جمع ہوتا ہے اب، مجاہدہ کچھ کرنے ہی نہیں دیتی۔ میں اس کے لیے اور بچوں کے مستقبل کی خاطر ہی بچت کرنا چاہتا ہوں مگر وہ سمجھتی ہے کہ میں کسی ”دوسری“ پہ لٹا کے آرہا ہوں۔ پچھلے دنوں سوچا کہ کوئی پلاٹ قسطوں پہ لے لوں۔ لیکن اسے خبر ہوئی تو فساد کھڑا کر دیا کہ اب میں ”دوسری“ کے لیے جائیداد بھی بنا رہا ہوں۔ لاحول ولا قوۃ۔“

...لیے تو کہہ رہا ہوں، جب نام بدنام ہو ہی چکا ...ئی کارنامہ پھڑکا ڈالو۔ بھئی ہم شریف مرد ہیں، نگا... اسی لیے ڈرتے ہیں تاکہ گھر کا ماحول خراب نہ ...ئی چخ چخ نہ کرے۔۔۔ تو تجھے اب کس بات کا ڈر؟ ...فساد تو روز کھڑا ہوتا ہے تمہارے گھر میں۔ تم ...ی کی اس بات کو سچ ثابت کر دو کہ چور چوری سے ...ر ہیرا پھیری سے نہ جائے۔“

...نظریہ قول بھی تو اتنا ہی سچا ہے کہ نظر سیر ہو تو ...نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوں، تب بھی دل نہیں ...تم بھی یوں سمجھو کہ میری نظر سیر ہو چکی ہے دل ...بھر گیا ہے میرا ان چکروں سے۔ واقعی طبیعت اس ...طرف اب مائل نہیں ہوتی، وہ عمر بھی تو نہیں رہی۔ ...کہ بلاوجہ یہ بات سمجھ جائیے۔“

...ہیں وہ ایک ”تجرباتی قسم کا شریف شوہر“ ثابت ...ہوتا۔

...بالکل ویسے ہی جیسے صدیق باجوہ ایک ”بنیادی طور ...شریف شوہر“ تھا۔

...آئیے دیکھتے ہیں رجب منظور، شریف شوہروں کی ...قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

☼ ☼ ☼

رجب منظور۔

...عمر چالیس سال، رنگ سانولا، قد پانچ فٹ سات ...انچ۔ کہیں کہیں آثار پائے جاتے ہیں۔

...تعلیمی قابلیت بی اے سیکنڈ ڈویژن۔

...پیشہ دکانداری۔۔۔ یعنی ایک عدد چلتے ہوئے جنرل ...اسٹور کا مالک۔ مالی حیثیت۔۔۔ اسٹور کی آمدنی کے ...علاوہ باپ کے ترکے سے ملنے والی زمینوں اور دکانوں کا ...کرایہ، اچھی خاصی قابلِ رشک۔۔۔

...ازدواجی حیثیت، شادی شدہ۔۔۔ اور ہم سب میں ...سب سے زیادہ نیا نویلا شادی شدہ۔ یعنی صرف پانچ ...سال پہلے ”شدہ“ کا خطاب ملا۔ بیوی۔۔۔ زویا، عمر ...سال۔ تعلیمی قابلیت میٹرک تک بتاتی ہے مگر ...کہ اس میں بھی کوئی خاص کامیابی نہیں ملی ہوگی۔ جس طرح اور سب کام اس نے دیر سے کیے، اسی طرح شادی کے چار سال بعد باپ بھی بنا۔ ایک گیارہ ماہ کی بڑی پیاری سی بچی ہے اس کی، جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ وہ جب اسے گود میں اٹھا کے باہر نکلتا ہوگا تو لوگ یہی کہہ کر مبارکباد دیتے ہوں گے۔

”ماشاء اللہ، کتنی کیوٹ پوتی ہے آپ کی۔“

زویا کے ساتھ تو اس نے اسی لیے باہر نکلنا تقریباً ترک کر دیا ہے۔ شروع شروع میں تو پھر بھی غنیمت تھا مگر اب تو وہ حال ہے کہ چالیسویں سال تک پہنچتے پہنچتے اس کی عمر نے قلانچیں بھر کے آگے نکلنا شروع کر دیا ہے اور زویا ہے کہ دن بدن پچھلی طرف دھکیل رہی ہے خود کو۔ چوبیس کی بجائے انیس بیس کی نظر آتی ہے اور کم عمر حسین بیوی، سونے پہ سہاگہ اگر وہ ترس ترس کے عمر کے پینتیسویں سال ملی ہو، اس کے آگے شریف شوہر بے چارے کی ویسے ہی گھگھی بندھی رہتی ہے اور شریف شوہر بھی وہ جو رجب منظور کی طرح فطری یا پیدائشی قسم کے شریف ہوں۔

بہت صبر کے بعد اسے سرا باندھنا نصیب ہوا مگر ہوا تو سہی۔

اس تاخیر کے پیچھے ان حضرت کی وہی شرافت آڑے آتی رہی، جو پیدا ہوتے ہی ان کی گھٹی میں ڈال دی گئی تھی۔ رجب منظور نے اتنی جلدی قد نہیں نکالا جتنی جلدی اس کی شرافت پھلی پھولی۔ اس کی شرافت کے ڈنکے جلد ہی خاندان سے نکل کر زمانے بھر میں بجنے لگے۔ ہر ماں کی طرح رجب منظور کی ماں بہنوں کے دل میں بھی اس کی شادی کے ارمان اس کے جوان ہوتے ہی جاگنے لگے تھے، لیکن خاندان برادری میں جہاں بھی اور جس لڑکی کا انہوں نے نام لیا، ماؤں نے بچیاں اپنے پلو میں چھپا لیں۔

”تو جی ہماری پھول سی بچی کے لیے یہی ”گھگھو گھوڑا“ رہ گیا ہے۔ مٹی کا مادھو۔۔۔ کاٹھ کا اُلو۔۔۔ گودی کا کاکا۔۔۔“

ایسے ایسے خطابات سے نوازا گیا بے چارے کو، اس کی سگی خالہ تک نے ٹکا سا جواب دے دیا، یہ کہہ

کر کے۔

"اے آپا! معاف کرنا' تم نے بیٹا اس ڈھنگ سے پالا ہی نہیں کہ اسے بیاہ سکو۔ تم نے تو اسے صرف ماں بہنوں کے اشاروں پہ ناچنا سکھایا ہے' اس کی بیوی جو بدنصیب بنے گی' ساری عمر تڑپ تڑپ کے روئے گی۔ نابابانا' میری بچی ہی کیوں۔"

"ہوش میں تو ہو' ماں کی تابعداری اور بہنوں سے محبت رکھنا بھی کیا میرے بیٹے کا عیب ہو گیا؟"

"جو چیز اعتدال سے بڑھ کر ہو' وہ عیب ہی کہلاتی ہے جسے آدھی رات تک ماں کی ٹانگیں دبانے کی بری عادت ہو' وہ بیوی کا سر کب دبائے گا؟ جسے صبح سویرے اٹھتے ہی ماں کا ناشتہ بنانے کی لت ہو' وہ بیوی کی چائے آخر کس وقت بنائے گا۔"

خاندان سے چار حرف بھیج کے باہر لڑکی تلاش کرنا چاہی تو وہاں بھی منہ کی کھائی۔ آس پاس سے انہیں لڑکے کی خطرناک حد تک بڑھی ہوئی شرافت کی سن گن مل ہی جاتی۔

"ماشاء اللہ' بڑا ہی سیدھا بچہ ہے۔" کوئی پڑوسن بتلا دیتی۔ "آج کل کہاں ہوتے ہیں ایسے لڑکے۔ مانو منہ میں زبان ہی نہیں۔ ہمارے بچے تو ٹیڑھی نظر برداشت کرنے کے روادار نہیں اور یہ بھلا مانس' ماں تو ماں' چھوٹی بہنوں کی سخت سست بھی ہنس کے سن لیتا ہے اور تو اور ماں کھینچ کے چپل دے مارے تو جھاڑ پونچھ کے اتنی عقیدت سے ماں کے پیروں میں پہناتا ہے۔ واہ سبحان اللہ۔" وہ جھوم کے قصیدے پڑھتیں اور لڑکی والے بدک جاتے۔

زوبیا کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ ماں باپ تو اس کے تھے نہیں' ماموں ممانی کے ہاں پلی بڑھی۔ شکل و صورت کی اچھی تھی' رشتے اور بھی مل سکتے تھے لیکن ممانی نے اپنا فائدہ دیکھا۔ اس وقت تک رجب کے والد بھی گزر چکے تھے' بہنیں ساری بیاہی جا چکی تھیں اور وہ بھی دور پار کے شہروں میں۔ یعنی ہر وقت سر پہ سوار رہنے والا بھی کوئی نہ تھا اور جو بھی اندھا کانا جہیز وہ دیتیں' اس پہ بھی ناک بھوں چڑھانے والا کوئی نہ تھا' ورنہ بھرے پرے سسرال میں لڑکی کا مطلب ہے روایتوں' رواجوں کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز۔ چوتھی' چالے کی رسمیں۔ پہنچانے کے خرچے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی زوبیا کا رشتہ وہاں کرنے کی ایک اور وجہ تھی اور وہ تھیں ممانی کی اپنی تین لڑکیاں جو شکل و صورت میں زوبیا سے دبتی تھیں اور اس سے بڑی ہونے کے باوجود ہر رشتہ زوبیا کی جانب لوٹ جاتا تھا' اس لیے ماموں ممانی نے اس پہلے آنے والے رشتے پہ ہی شکر کرتے ہوئے اسے گھر سے نکالنے کی کی۔

اوروں کو شاید لگتا ہو کہ رجب منظور ایک خوش قسمت آدمی ہے' جس کو اس واجبی سی صورت کے ساتھ اور اس عمر میں زوبیا جیسی کم عمر' حسین اور نفس مکھ بیوی مل گئی ہے' لیکن حقیقت کی عینک لگا کے دیکھیں تو رجب منظور سے زیادہ قابل رحم حالت اس وقت ہم چاروں میں سے کسی کی نہیں۔ ایک تو بے چارہ اپنی شرافت کے ہاتھوں پینتیس سال تک کنوارا رہا اور اب اسی شرافت کی وجہ سے زوبیا جیسی اس کی ٹانگ برابر کی کل کی چھوکری اس کے سر پہ راج کر رہی ہے۔ اس جیسے پیدائشی شریف دنیا میں آتے ہی کسی نہ کسی کی اطاعت کرنے ہیں۔ ماں کی گدی اب بیوی نے سنبھال رکھی تھی۔ رجب کا ریموٹ کنٹرول زوبیا کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ یہ بات ہم سب جانتے تھے' اسی لیے میں نے اسے "سزا یافتہ قسم کا شریف شوہر" کا ایک اضافی خطاب بھی دے رکھا۔

☆ ☆ ☆

اور یہ میں ہوں۔

حیدر مجید۔

عمر' چھتیس سال' رنگ گندمی' قد پانچ فٹ دس انچ' بالوں اور آنکھوں کی رنگت سیاہ۔

پیشہ' الیکٹرونکس کا ذاتی بزنس۔ مالی حیثیت مستحکم اور تسلی بخش ہوتی۔ اگر حمیرا (میری نصف بہتر) اس قدر فضول خرچ نہ واقع ہوتی۔ بہرحال بزنس ٹھیک ٹھاک ہے۔

ازدواجی حیثیت۔ دس سال پہلے شادی ہوئی تھی۔ تین بچے' بالترتیب نو اور سات سال کی دو بیٹیاں اور ایک تین سال کا بیٹا۔

بیوی حمیرا۔ عمر' تیس سال (تصدیق شدہ) خوش شکل' خوش لباس اور خوش اطوار۔ مناسب حد تک تعلیم یافتہ بھی ہے' گھڑ ہے۔ خصوصاً کچن کے معاملے میں۔ کھانا بے حد لذیذ بناتی ہے۔ میرے گھر والوں سے بھی اس کے تعلقات معقول رہے ہیں۔ ان دس سالوں میں کوئی خاص بڑا معرکہ نہیں ہوا۔ دیورانیوں جٹھانیوں سے معمولی چپقلش تو فطری سی بات ہے' البتہ میری امی اس سے بہت خوش ہیں جو کہ ظاہر ہے' بہت بڑی بات ہے اور میرے لیے اطمینان کا باعث بھی۔ صرف تین خامیاں ہیں اس میں۔ نمبر ایک۔ کانوں کی کچی ہے' لوگوں کی' خصوصاً مجاہدہ بھابھی کی باتوں میں بہت جلدی آجاتی ہے اور مجاہدہ بھابھی کی باتیں۔ انہوں نے ہمیشہ دوسروں کے دلوں میں وسوسہ پیدا کرنے والی باتیں ہی کی تھیں۔

نمبر دو۔ فضول خرچ ہے۔ صرف اپنی ذات پہ ہی نہیں بلکہ آس پاس ہر جگہ پیسہ لٹانے کا خبط ہے۔ گھر کا کونہ کونہ قیمتی ڈیکوریشن پیس سے اٹا پڑا ہے۔ ہر دوسرے سال فرنیچر اور پردے بدلنے کا جنون ہے۔ بھلا فرنیچر کباڑیے کوڑیوں کے دام لے جاتے ہیں۔ بچوں کو مہنگے ترین اسکول میں ضد کر کے داخل کرا رکھا ہے۔ میکہ ہو یا سسرال ہر جگہ اوقات سے بڑھ کر تحفے دینے کا شوق اور خود اس کے جو ذاتی اخراجات ہیں ان کا تو کوئی حساب کتاب بھی نہیں۔ میری آدھی کمائی تو علاقے کے درزیوں کے پاس جاتی ہے۔

نمبر تین۔ اپنی تمام تر اچھائیوں' خوبصورتی اور سگھڑاپے کے باوجود وہ ہے تو ایک بیوی۔ سر سے پیر تک بیوی۔

اس کا خالص "بیوی پن" اس کی تیسری بڑی خامی ہے۔ جس سو میرے ہزاروں روپے اجاڑ کے بوتیک سے جو بچیں' چھیلی نوعمر لڑکیوں والے ڈریس لاتی ہے' فلمی رسالے دکھا دکھا کے درزیوں سے جو فٹنگ والی قمیص سلواتی ہے' ہر مہینے بیوٹی پارلر کی یاترا کرتی ہے اور اس نے جو اپنے شانوں تک کٹے بالوں میں گولڈن اسٹریکنگ کروا رکھی ہے۔ ان سب کے باوجود وہ ہر زاویے سے دس سالہ پرانی بیوی کے علاوہ اور کچھ نہیں لگتی' جبکہ میرا دل ہمیشہ سے ایک محبوبہ کا طالب رہا ہے۔

شادی کے ابتدائی چند مہینے ہی ایسے گزرے تھے جس میں میری اس طلب کی تھوڑی بہت تسکین ہوئی' لیکن اس نے محبوبہ کو مقتولہ بنانے کا عمل اس سرعت سے مکمل کیا کہ دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گئے۔

میں شروع سے ہی رومانٹک بندہ ہوں لیکن دل میں امنڈتے اس رومانس کے طوفان کو ہمیشہ دل تک ہی محدود رکھا۔ اس کے پیچھے رجب منظور کی طرح میری شرافت نہیں بلکہ بزدلی کارفرما تھی۔ شادی ہوئی تو میرے اندر کے رانجھے نے حمیرا میں ہی اپنی ہیر کو تلاشنا چاہا اور تب مجھ پہ انکشاف ہوا کہ دنیا کی بڑی بڑی اور مشہور اسٹوریز کا انجام "اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے" پہ کیوں نہیں ہوا تھا۔ رانجھے کو ہیر۔ مجنوں کو لیلیٰ اور رومیو کو جولیٹ کیوں نہیں ملی تھی۔ اس لیے کہ تقدیر کو ان کے عشق کی سلامتی منظور تھی۔ اگر رانجھے کی ہیر سے اور مہینوال کی سوہنی سے شادی ہو جاتی تو عشق کی یہ بے نظیر داستانیں آج صدیوں بعد زندہ بھی نہ ہوتیں' بلکہ شادی کی پہلی اینی ورسری پہ ہی چپکے سے اپنی موت آپ مر جاتیں۔ یہی انجام میری حمیرا سے چند روزہ طوفانی محبت کا ہوا۔ ادھر اس نے درزی کا بل میرے ہاتھ میں تھمایا' نئی ملازمہ کی تنخواہ طلب کی اور اپنی پاکٹ منی کا حساب کتاب دہرایا' ادھر میرا عشق قلابازیاں کھاتا فنا ہو گیا۔

"نہیں۔ فنا نہیں ہوا بلکہ اب بھی دل کے اندر چٹکیاں بھرتا رہتا ہے۔ ان دس سالوں میں ایک نہیں' دو نہیں' تین بھی نہیں بلکہ بلا مبالغہ دس ہزار مرتبہ میرے اندر کسی سے بھرپور عشق لڑانے کی خواہش انگڑائیاں لے کر اٹھی اور میں دل کی اس آواز پہ لبیک

کہتے ہوئے سنجیدہ بھی ہو اگر۔۔۔

نہیں بزدلی یا کم ہمتی نہیں۔۔۔ اس بار کم نصیبی آڑے آئی۔ شادی کے بعد مرد خاصا دیدہ ہوائی ہو جاتا ہے۔ پہلے پھر بھی کسی لڑکی کو تاڑتے ہوئے اس کی جوابی گھوری پہ میں گڑبڑا کے آنکھیں جھکا لیا کرتا تھا' اب ایسا نہیں تھا۔ ڈھٹائی سے ٹکٹکی باندھ کے گھورا کرتا اس کی ناگواری کے جواب میں مسکراہٹ بھی اچھال دیا کرتا تھا۔ اکثر حمیرا ساتھ ہوتی اور حسب عادت شاپنگ میں بری طرح غرق۔۔۔ اور میں آس پاس شاپنگ کرتی خواتین میں بری طرح غرق۔ مگر برا ہو قسمت کا' بھرپور کوشش کے باوجود اب تک کسی دھواں دار عشق کے آثار پیدا نہ ہو سکے تھے۔

میں نے تو اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کر ڈالی تھی۔ میرے اپنے خاندان میں میری عمر کے جتنے بھی کنوارے رہ گئے تھے' ان سے راہ و رسم بڑھانا چاہا تب انکشاف ہوا' رشتے کی ان نندوں سے حمیرا کے تعلقات حیران کن حد تک خوشگوار تھے۔ (وجہ وہی آئے دن کے قیمتی تحائف) وہ اتنی شیرینی گھول کے اسے بھابی اور مجھے بھائی جان کہا کرتیں کہ میں مارے تلملاہٹ کے کمرے سے ہی نکل جاتا۔ اس کے اپنے خاندان۔۔۔ یعنی اپنے سسرال میں میں نے ایسی حسیناؤں کا کھوج لگانا چاہا جن کی حمیرا سے نہ بنتی ہو۔ شاید کسی کزن سے شادی سے پہلے کوئی ایسی کھٹ پٹ رہ چکی ہو کہ اب وہ بدلے کی نیت سے مجھ سے محبت کی پینگیں بڑھانے پہ آمادہ ہو جائے مگر میری قسمت کہ رشتے کی ساری سالیاں اب اپنی اپنی گھر والیاں تھیں۔

ساری کالونی چھان ماری کہیں کوئی بڑھتی عمر کی کنواری دوشیزہ دستیاب نہ ہوئی جو اچھے رشتے کی آس لیے یا فرسٹریشن کے مارے مجھ جیسے شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ پہ ہی صبر شکر کرنے پہ آمادہ ہو جائے اور تو اور کوئی معقول قسم کی بیوہ خاتون بھی میسر نہ ہوئی۔ میری ان باتوں پہ آپ میں سے اکثر کو ناگواریت محسوس ہو رہی ہو گی۔ مجھے آپ خواتین کے احترام سے نابلد' اخلاق سے عاری اور گرے ہوئے کردار کا شخص قرار دے رہے ہوں گے۔ میں انکار نہیں کروں گا۔۔۔ ہاں ہوں میں۔۔۔ ایسا ہی ہوں۔ ثابت کر کے دکھایئے۔ میرے ریکارڈ پہ کوئی دھبہ؟

نہیں نا؟ اس لیے نہیں کہ میں کھیلے بہت مقفل سے کرتا ہوں اور پیچھے ثبوت نہیں چھوڑتا۔ بلکہ اس لیے کہ قسمت نے اب تک کھیل کھیلنے کا گولڈن چانس ہی نہیں دیا۔ جب جب اپنا اصلی رنگ دکھانا چاہا' معجزاتی طور پہ سارا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ یوں جناب میں ٹھہرا ایک معجزاتی طور پہ شریف شوہر۔

میرے جیسے شخص کا دس سال تک صرف زبانی کلامی ہی نہیں بلکہ عملی لحاظ سے بھی شریف ثابت ہونا ایک معجزہ ہی تو ہے۔

☼ ☼ ☼

"آج مجاہدہ نے بڑی عجیب خبر سنائی۔" اگلے دن ناشتے کی ٹیبل پہ حمیرا نے بتایا۔ توسٹ میرے حلق میں پھنسنے لگا۔ مجاہدہ بھابی اور ان کی خبریں' ان کو صبح صبح سننے کا مطلب ہے سارے دن کی بے زاری اور کوفت۔ حمیرا اچھی طرح جانتی تھی کہ مجھے نہ مجاہدہ بھابی سے دلچسپی تھی نہ ان کی عجیب و غریب خبروں سے اس کے باوجود وہ ان کی تراشی ہوئی خبریں میرے کانوں میں پھونکنے سے باز نہ آتی تھی۔

"نعمان کے کسی اور بھولے بسرے افیئر کی ٹن گن مل گئی ہو گی اور اس سے زیادہ عجیب خبریں وہ عورت کیا سنا سکتی ہے۔" میں نے اکتاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ "وہ بے چارہ تو کب کا اپنی تمام محبوباؤں کے چہرے تو کیا نام تک بھول بھال چکا ہے۔ یہ پتہ نہیں کہاں کہاں سے کرید کے خبریں لے آتی ہے۔ خود اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مار رہی ہے احمق!"

"تمیز سے بات کریں حیدر!" حمیرا نے خالص بیوی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹوکا۔

"منہ پہ تو بڑا بھابی بھابی کرتے ہیں اور پیٹھ پیچھے کس بد تہذیبی سے ذکر کر رہے ہیں۔ آپ کے دوست کی بیوی ہیں اور کچھ نہیں تو ایک عورت ہونے کے ناتے ہی احترام کر لیں۔"

"تمہیں بہت ہمدردی ہے اپنی سہیلی سے' تو مجھے احترام کے درس دینے کی بجائے اسے عقل سکھاؤ۔ کیوں گڑے مردے اکھاڑ کے اپنا گھر خود اجاڑنے کے سامان پیدا کر رہی ہے۔ جس زندگی پہ لعنت بھیج کے اب وہ ایک مکمل گھر ہستن شوہر بن چکا ہے' اس زندگی کی یاد دلا دلا کے کیوں اسے پچھتاوے میں مبتلا کرتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ پچھتاوا اسے دوبارہ اس رنگا رنگ زندگی کی جانب لوٹا دے۔"

"واقعی بات تو آپ نے سولہ آنے درست کی ہے۔" وہ قائل ہو گئی۔ یہ میرا آج کا پہلا کارنامہ تھا جس پہ میں ازحد مسرور ہوا۔ بیوی کو چند منٹ میں کسی بات پہ قائل کر لینا کسی بھی شوہر کے لیے ایک بڑی کامیابی ہوتی ہے اور اس پہ پھولے نہ سمانا اس کا حق۔ میری بھی گردن ذرا کچھ اور اکڑ گئی۔

"لیکن فی الحال میں جو خبر سنانے جا رہی ہوں وہ مجاہدہ نے نعمان بھائی کے بارے میں نہیں' بلکہ رجب بھائی کے بارے میں بتائی ہے۔"

"آ۔۔۔ بے چارہ رجب منظور!" اپنے اس بے ضرر سے قدرتی شریف شوہر کا ذکر مجھے اداس کر گیا۔ "اس کے بارے میں اب عجیب سے عجیب خبر بھی مجھے عجیب نہیں لگتی۔"

"اب کیا کیا ہے اس نے؟ کیا دیکھ لیا مجاہدہ نے؟ اسے زوبیا کے پیر دباتے دیکھ لیا یا سر میں تیل کی مالش کرتے ہوئے؟ اس کے کپڑے دھوتے ہوئے پکڑے یا استری کرتے ہوئے؟ یہ اپنی اس بزدلانہ شرافت کے ہاتھوں اپنا کباڑا تو کر ہی رہا ہے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ڈبوئے گا۔ اس کی ایسی ہی اوٹ پٹانگ فرماں برداریوں کے باعث تم لوگوں کو بھی ہڑک اٹھتی ہے۔"

"مجاہدہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔" مجھے کافی دیر تک افسوس بھری نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے جیسے خود کلامی کی تھی اور میں ہونق بنا گیا۔

بیوی کے علاوہ کوئی بھی دوسری عورت آپ کے بارے میں کیا کہتی ہے یہ جاننے کا اشتیاق ہر مرد کو ہوتا ہے مگر مجاہدہ بھابی جیسی خاتون کسی بھی مرد کے بارے میں کیا تاثرات رکھتی ہیں' اس کا اندازہ بھی تھا مجھے۔ اس لیے جب میں نے حمیرا سے اس کی بڑبڑاہٹ کی وضاحت طلب کی تو میرے لہجے میں اشتیاق سے زیادہ ناگواری تھی۔

"یہی کہ آپ بات پلٹنے اور گفتگو کو طول دینے کے فن میں عورتوں کو بھی مات دیتے ہیں۔"

"تمہیں کیا پتہ میری بھولی بیگم! میں تو عمر بھر عورتوں سے ہی مات کھاتا آیا ہوں۔" میرے دل نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ایک کے بعد ایک وہ سارے دل نشیں چہرے یاد آنے لگے' جن سے عشق بس ہوتے ہوتے رہ گیا۔

"مگر اب نہیں۔۔۔ عمر بیتی جائے اور کوئی چکر نہ چل پائے۔۔۔ نہیں نہیں' عمر کی اس چوتھی دہائی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے کم از کم ایک زبردست دھواں دار عشق تو میرے کریڈٹ پہ ہونا چاہیے ورنہ تف ہے میری مردانگی پہ۔۔۔ اور حیف ہے میری جوانی پہ۔۔۔ سنا ہے جوانی گدھے پہ بھی آتی ہے اور لگتا ہے مجھ پہ گدھے والی جوانی ہی آئی ہے۔ نہ رنگ' نہ روپ۔۔۔ بس ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے جاؤ اور بوجھ ڈھوتے جاؤ۔"

"سنیں' اس ہفتے مجھے کچھ ایکسٹرا رقم چاہیے۔" حمیرا نے میرے خیالات کا تسلسل توڑا۔

"تمہیں کس ہفتے نہیں چاہیے ہوتی۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ ایک ڈھنگ کا کپڑا نہیں ہے میرے پاس۔" اس نے ہمیشہ کا رونا رویا۔

"تو وہ جو ہر دوسرے دن نیا جوڑا پہنتی ہو تو کبھی کبھار ڈھنگ کا بھی لے لیا کرو' کس نے روکا ہے۔"

"توبہ' چار پیسے بیوی پہ خرچ کرنے کے لیے اتنی لمبی بحث؟ اب آپ کو دیر نہیں ہو رہی؟ کیا زندگی ہے میری بھی۔ ذرا ذرا سی چیز کے لیے منت کرنی پڑتی ہے۔ سو طعنے سننے پڑتے ہیں۔ ہر وقت آپ تو میرے کپڑے

جوتے ہی گنتے رہتے ہیں۔ ہاں تو کیا کروں؟ کھاتے پیتے گھرانے کی ہوں۔ ہاتھ روک کے خرچ کرنے کی عادت نہیں۔ ماں باپ نے لاڈ کر کے عادتیں بگاڑ دیں اور ایک وہ زویا ہے۔ یتیم مسکین، غریب گھر کی لڑکی اور کیسے عیش کر رہی ہے۔ آنکھیں بند کر کے رجب بھائی اس کی ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔"

"ہاں تو کیوں نہ کرے، کالج گرل جیسی بیوی چالیس سال کی عمر میں مل جائے تو جورو کا غلام بننے کی کوئی تک بھی بنتی ہے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا شوروم کے لیے نکلنے کا ٹائم ہو چکا تھا۔

"ہونہہ... جورو کا غلام اسے تو اب پتہ چلے گا۔ بڑا اتراتی ہے پلو سے میاں کو باندھ کے۔" وہ پتہ نہیں کیا بڑبڑاتی رہی۔ میں توجہ دیے بغیر باہر نکل گیا۔

آج پھر میں گاڑی مین روڈ پہ ڈالنے کے بجائے منی مارکیٹ کی طرف لے آیا۔ پرسوں اتفاقاً میں نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ رات کی تیز آندھی کے باعث گرنے والے درختوں نے مین روڈ کی ٹریفک بلاک کی ہوئی تھی۔ میں منی مارکیٹ کی طرف نکل آیا، جہاں سے ایک شارٹ کٹ وحدت روڈ کی طرف نکلتا تھا اور وحدت روڈ سے اپنے شوروم جانے کے لیے مجھے پندرہ بیس منٹ لگتے تھے۔ اسی راستے پہ وہ پرسوں مجھے پہلی بار ملی تھی۔ منی مارکیٹ میں رات کے وقت خاصی رونق ہوتی تھی لیکن اس وقت دن کے دس بجے یہ مارکیٹ ویران پڑی تھی۔ ایسے میں اس خاتون کو ڈھیر سارے شاپنگ بیگز کے ساتھ فٹ پاتھ پہ غالباً کسی کنوینس کے انتظار میں کھڑے دیکھ کے خود بخود میری اسپیڈ آہستہ ہو گئی۔ یہ ایک فطری سی بات تھی، کوئی منظر آپ تفصیل سے دیکھنا چاہیں گے تو ظاہر ہے کہ آپ کے قدم خود ہی آہستہ ہو جائیں گے۔ لیکن جب اسے ہاتھ ہلا کے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے دیکھا تو ایک منٹ کے لیے تو مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین ہی نہیں آیا۔

"کیا یہ عورت لفٹ مانگ رہی ہے؟"

یقین اس لیے نہ آیا کہ اب تک میرے ساتھ ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں لفٹ دینا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس لیے کہ جب لفٹ دینے کی عمر تھی (یعنی جب کوئی لے بھی لیتی) تب دینے کی اوقات نہ تھی، میں خود پیدل تھا۔ گاڑی آتے آتے دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ اب لفٹ دینے کی اوقات تو تھی مگر کوئی "لفٹ" کراتی ہی نہ تھی اور وہ خود ہاتھ ہلا کے مجھے رُکنے کا اشارہ کر رہی تھی... حیرت انگیز؟

یقین آتے ہی میرے پاؤں بریک پہ جا پڑے۔

"جناب! کیا آپ مجھے ایم ایم عالم روڈ تک اتار سکتے ہیں؟"

اب کہاں وحدت روڈ، جہاں میں اس وقت کھڑا تھا۔ اور کہاں ایم ایم عالم روڈ، جہاں وہ جانا چاہتی تھی۔ میں نے ایک سرسری سی نظر اس پہ ڈالی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ جس سے بچنے کی خاطر اُس نے سر پہ ایک فائل رکھی ہوئی تھی۔ گولڈن براؤن ترشے ہوئے بال، جدید تراش خراش کا لباس، متناسب قد و قامت ڈارک سن گلاسز... شیریں لب و لہجہ۔

"آیئے۔" میں نے اسی موہوم سی آس کے سہارے فرنٹ ڈور کھول دیا جس آس کے ساتھ میرا چھتیس سالہ دل پچھلے بیس سالوں سے جی رہا تھا۔

"شکریہ... کوئی ٹیکسی، رکشہ مل ہی نہیں رہا تھا اس لیے آپ کو زحمت دی۔" اس نے اپنا چشمہ اتار کے شولڈر بیگ میں رکھ لیا تھا اور اب قریب سے دیکھنے پر مجھے اس عمر کا اندازہ ہوا۔ اگرچہ دن کے وقت بھی اس نے خاصی لیپا پوتی کر رکھی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے گہرے رنگوں، مسکارے اور آئی لائنر سے بوجھل تھے۔ مگر ان آنکھوں کے اندر پھیلی زردی کی ہلکی سی تہہ... اور مسکرانے کی کوشش کے دوران ان کے گوشوں پہ واضح ہوتی ان گنت سلوٹیں ان کی بوسیدگی ظاہر کر رہی تھیں۔ رنگ صاف تھا، جلد چمکدار... جس پہ سنہرا رواں واضح تھا۔ بھرے بھرے ہونٹ تیز رنگ کی لپ اسٹک سے جگمگا رہے تھے۔ گولڈن براؤن بال اتنے روکھے پھیکے اور ہلکے تھے کہ

ظاہر ہوتا تھا، وہ انہیں رنگنے کی برسوں سے عادی

"آپ شاپنگ کر کے آ رہی ہیں یا آفس جا رہی ہیں؟" میں نے شاپنگ بیگز کا ڈھیر اور ہاتھ میں تھامی پلاسٹک فائل کو دیکھ کے پوچھا۔

"دونوں سمجھ لیں۔ یہ میری شاپنگ ہی ہے۔ مگر میں اس وقت کام سے نکلی ہوں، دراصل میرا مختلف بوتیکس سے معاہدہ ہے۔ میں گھروں میں بیٹھ کے کام کرنے والی ہنر مند خواتین سے بلاک پرنٹنگ، ٹائی اینڈ ڈائی اور کروشیا وغیرہ کا کام کراتی ہوں، یہ آرڈر میں بڑی بڑی نامور بوتیکس سے حاصل کرتی ہوں اور پھر اپنی کمیشن پہ انہیں سپلائی کرتی ہوں۔ یہ ایک طرح سے شاپنگ ہی کر کے آ رہی ہوں میں اور اب سپلائی کرنے نکلی ہوں۔"

"خاصی ٹف جاب ہے۔"

"کوئی ایسی ویسی... بائی دا وے آپ کیا کرتے ہیں؟"

"بس جی، بزنس ہے چھوٹا موٹا۔" میں نے انکساری کا مظاہرہ کیا اور ساتھ ہی اپنا تعارف بھی کروا دیا۔

"اوہ، سوری مجھے بھی پہلے اپنا تعارف کروانا چاہیے تھا، میرا نام شبانہ ہے۔"

نہ کوئی مسز، نہ بیگم... دل کو اس تعارف سے ذرا تسلی ہوئی۔ وہ میری ہم عمر تو نہیں بلکہ شاید مجھ سے چار پانچ برس بڑی ہی ہو گی۔ مگر اتنے سالوں میں وہ ایسی پہلی عورت تھی جو میری گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ میرے برابر بیٹھی تھی اور میری بیوی بھی نہیں تھی، اس لحاظ سے وہ خود بخود ایک خاص حیثیت اختیار کر گئی۔

اس دن سارا وقت میں کام میں دھیان نہ لگا سکا۔ اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی ڈھلتی عمر... رنگے ہوئے بے رونق بال... پژمردہ آنکھیں، لٹکی ہوئی کھال والے ہاتھ... سب نظر انداز کر کے میں اس کی شخصیت کے خوش کن پہلو تلاشتا رہا۔

"کتنی شیریں بیاں ہے اور خوش ذوق بھی۔ کیا عمدہ لباس تھا اور موسم کی مناسبت سے رنگوں کا استعمال لاجواب، آرٹسٹک مزاج لگتی ہے اور کیوں نہ ہو، کام ہی ایسا ہے اور ہاں خود اعتماد بھی ہے۔"

باتوں باتوں میں اس نے بتایا تھا کہ وہ پرسوں پھر منی مارکیٹ اسی وقت آئے گی۔ کیونکہ صبح صبح رش کم ہوتا ہے اور وہ ڈائی والے کو تسلی سے کپڑوں کے بارے میں تفصیلاً سمجھا سکتی ہے۔ سو اسی لیے آج میں یہاں تھا۔ جس فٹ پاتھ پہ اسے لفٹ دی تھی۔ آج وہ وہاں نہ تھی میں نے گاڑی مارکیٹ کے اندر موڑ لی۔ چھوٹی سی مارکیٹ تھی۔ میں اسی سڑک کی طرف گیا جہاں ٹیلرز زیادہ ہوتے ہیں۔ حمیرا کی وجہ سے یہاں اکثر ہی آنا ہوتا تھا... اور حسب توقع وہ ایک پیکو کرنے والے کے پاس کھڑی نظر آ ہی گئی۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے اتفاقاً یہاں سے گزرتے ہوئے میری اس پہ نظر پڑی اور میں نے اخلاقاً گاڑی روک دی۔ البتہ اس نے مجھے سامنے پا کے اپنے بے ساختہ تاثرات چھپانے کی قطعی کوشش نہ کی اور یہ تاثرات... خاصے حوصلہ افزا تھے۔

"سنیں، آپ کے آفس میں میرے لیے کوئی جاب نکل سکتی ہے؟" بیٹھتے ہی اس نے بڑی آس سے پوچھا۔ ہال روڈ پہ واقع میرے شوروم میں الیکٹرونکس کی اشیاء کا بزنس ہوتا تھا اور اس میں کسی فی میل اسٹاف کی نہ تو ضرورت تھی، نہ ہی گنجائش، اس کے باوجود میں نے چند سیکنڈ تک رُک کے سوچا... شاید کہیں نہ کہیں اسے فٹ کیا جا سکے۔ اور بالآخر مایوس ہو کے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا کروں، کوئی بڑی ڈگری بھی نہیں ہے۔ اس کوالیفکیشن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کہیں ٹیلی فون آپریٹر لگ سکتی ہوں یا کسی تھرڈ کلاس دفتر میں سیکریٹری، وہ بھی دو ڈھائی ہزار روپے کی تنخواہ پر، جو کام میں کرتی ہوں اس میں کم از کم کسی کی غلامی تو نہیں ہے۔ ایک لحاظ سے بزنس ہی ہے یہ بھی۔ آمدنی بھی گزارے لائق ہو ہی جاتی ہے لیکن سر کھپائی بہت ہے۔ اور آنے جانے کا خرچہ الگ، رکشے ٹیکسی میں

ہی روز کے سوڈیڑھ سو لگ جاتے ہیں۔ پھر اپنی ٹپ ٹاپ کا بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے ورنہ یہ اونچے اونچے بوتیک کہاں اندر آنے دیتے ہیں! اس لیے سوچا کہیں اور قسمت آزمائی کی جائے۔ مہنگائی بھی تو کس قدر بڑھ گئی ہے اور... اخراجات...“

میرے دل نے ایک اور خوش فہمی پالی اور وہ یہ کہ... کوئی عورت جب کسی کے سامنے اپنی مجبوریوں اور بے چارگی کا رونا روتی ہے تو مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے ان پریشانیوں سے نجات دلادے اُس کا ہاتھ تھام کے ان حالات سے باہر نکال دے اور وہ اتنی اپنائیت سے میرے ساتھ اپنے پرسنل پرابلمز ڈسکس کر رہی تھی اور وہ بھی محض دوسری ملاقات میں۔

”کیا وہ مجھے اپنا نجات دہندہ... اپنا ہیرو تصور کرنے لگی ہے؟“

اس سوال کے ذہن میں سر سراتے ہی میرے اندر ایک اَمنگوں بھرا ”ہیرو“ انگڑائی لے کے بیدار ہو گیا۔

”آپ فکر مت کریں۔ میرے سرکل میں بہت سے ایسے فرینڈ ہیں جن کے بزنس چیمبر میں آپ کے لیے کوئی نہ کوئی مناسب ملازمت کی گنجائش پیدا کر دی جائے گی۔ کوالی فکیشن اِز نو پرابلم۔“ میں نے ہاتھ لہرا کے کہا۔ وہ ممنون انداز میں مسکرائی۔

”واقعی حیدر صاحب؟“

”بالکل... صرف میرے ایک بار کہنے پہ... اور میں یہ کر رہا ہوں... صرف آپ کے کہنے پہ...“ میں نے کچھ اور چلبلا... کچھ اور زیادہ خوش مزاج ہونے کی کوشش کی۔

”اگر آپ ایسا کر دیں تو یہ واقعی بہت بڑا احسان ہو گا مجھ پہ۔ کیا میں آپ کو حیدر صاحب کے بجائے صرف حیدر کہہ کے پکار سکتی ہوں؟“ وہ ایسی تمام سیڑھیاں از خود طے کر رہی تھی جو میں کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔

”ارے میری شبو رانی! تم مجھے جانو ڈارلنگ ساجن، ماہیا کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔“ صد شکر کہ یہ چھچھوری سی سرگوشی میرے دل نے کی تھی لب تک

نہ آئی تھی ورنہ اب تک کا سارا سو برامیج ڈاؤن فال ہو جاتا۔ میں نے ڈیک آن کیا۔

تیرے بنا زندگی سے شکوہ، تو نہیں
تیرے بنا زندگی بھی لیکن زندگی تو نہیں

”دھت تیرے کی۔ یہ حمیرا کی چوائس... یعنی تو بڑی الٹرا ماڈ ہے اور گانے چُن چُن کے سن باسٹھ کے اکٹھے کر چھوڑے ہیں۔“ میں نے تلملا کے سوچا۔ دراصل اس گانے کے بولوں کے فضا میں بکھرتے ہی سفید ... والا پچاس سالہ ہیرو اور سفید بالوں اور نظر کے چشمے والی پینتالیس سالہ ہیروئن تصور کی اسکرین پہ روشن ہو گئے تھے۔ میں نے سائڈ چینج کی۔

تم آگئے ہو... تو نور آگیا ہے
نہیں تو چراغوں سے لَو جا رہی تھی

”ابھی سے کہاں...؟ ابھی تو جمعہ جمعہ آٹھ دن چھتیس سال کا ہوا ہوں۔ ابھی سے میرے چراغوں سے لَو کیوں جانے لگی بھلا۔“ میں نے بیزار ہو کے یہ کیسٹ نکال دیا۔ رات کو وہی بدذوق میرے ساتھ تھی اور یہ بوڑھے گانے سن سن کے جھوم رہی تھی۔ میں نے چُن کے ایک اور کیسٹ نکال کے لگایا۔

”کجرا رے... کجرا رے“ تیرے کالے کالے نیناں۔“

اسٹرنگ پر انگلیاں بجاتے اور سیٹی کی دھن سے گانے کے شوخ بولوں کا ساتھ دیتے ہوئے میں نے خود کو ”ہنٹی“ اور اس کو ”ببلی“ تصور کیا۔

☼ ☼ ☼

”دوسری ملاقات میں میں نے اسے اپنا سیل نمبر دیا اور اُس کا لیا تھا اور آج پورے دن میں اس کے چار ایس ایم ایس آ چکے ہیں۔“ اگلے دن یاروں کی محفل میں بیٹھا میں ساری روداد سنا رہا تھا۔

”چار...؟ اکٹھے چار...؟“ مولوی رجب منظور منہ کھول کے رہ گیا۔

”یار! یہ موبائل فون... ہائے کیوں نہ تھا یہ ہمارے زمانے میں؟“ نعمان علی نے آہ بھری۔

”ہمارا زمانہ...؟ کیا مطلب؟“ آج کل میں ویسے ... ایج کانشس رہتا تھا۔ اس کی یہ بات مجھے پتا ...

”یہ ہمارا زمانہ ہی ہے، ہم ٹائم مشین کے ذریعے ... میں نہیں آبیٹھے۔“

”چھوڑو یار! اب کیا زمانہ اور کیسا زمانہ... زمانہ تو تھا جب دنیا جیب میں ہوتی تھی۔ کاش تب بھی موبائل اتنا ہی عام ہوتا جتنا آج ہے۔ اس وقت بھی ہر ... مٹھی میں دبوچے ہوتی۔ کیا کیا پاپڑ بیلنے ... تھے رقعے پہنچانے میں... اور فون کرو تو دس کا ... ضائع ہوتی تھیں۔ کبھی باپ فون اٹھا لیتا تو کبھی ... سہولت تو اب ہے۔ اسکول کے ٹانگ برابر ... سیل فون کان سے لگائے ڈیٹ فکس کر رہے ہوتے ہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ...“ مولوی رجب نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”کیا زمانہ آگیا ہے۔ اسکولوں کے لونڈے ... کان سے لگائے عاشقی معشوقی کھیل رہے ہیں اور ”سانٹھے پاٹھے“ موبائلوں پہ رومانٹک پیغامات وصول کر رہے ہیں۔“

”سانٹھا پاٹھا“ ہو گا تو خود...“ میں تلملا اٹھا۔ ”بلکہ ”ستر ابہترا“ (ستر بہتر سال کا) میں تجھ سے پورے چار سال چھوٹا ہوں۔ اور شبانہ ایک مہذب اور سلجھی ہوئی خاتون ہے۔ کوئی رومانٹک پیغامات نہیں بھیجے اس نے... مرو... خود دیکھ لو۔ پہلے میں صرف حال ... دریافت کیا گیا ہے۔ دوسرے میں کل کی لفٹ کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ تیسرے میں جاب کے وعدے کی ... دہانی کرائی گئی ہے اور...“

”جاب کا وعدہ... کیسا وعدہ؟“ میری بات پکڑی گئی ... سارا قصہ سنانا پڑا۔

”تو اب ڈھونڈ کوئی ملازمت، یہاں آرام سے کیوں بیٹھا ہے۔ تیرے تو بڑے بڑے کاروباری لوگوں سے گہرے مراسم ہیں۔“ نعمان نے لہجے میں طنز کا تڑکا لگا کے کہا۔

”کم عمری میں ہی تم لوگوں کی واہیات اور تھرڈ کلاس

محبت میں پھنس گیا۔ اچھے اور بڑے لوگوں سے کیا خاک تعلقات رکھ پاتا۔ اب تو تم ہی لوگ کچھ کرو۔“

”اگر خاتون ضرورت مند ہیں، باصلاحیت ہیں تو میں ایک آفر دے سکتا ہوں۔“ رجب منظور نے کہا۔

”تم سے ذکر کیا تھا نا میں نے کہ شیخوپورہ والے دونوں مکان بیچ دیے ہیں۔ کرایہ لینے کی بڑی دردسری تھی۔ وہ رقم میں نے اپنے وائے بلاک والے سپر اسٹور پہ لگوئی ہے۔ جنرل گروسری بیسمنٹ میں شفٹ کر دی ہے۔ گراؤنڈ فلور پہ کراکری اور بچوں کے کھلونے وغیرہ ہیں۔ اس سے اوپر کاسمیٹکس اور ریڈی میڈ کپڑے وغیرہ۔ اگلے ہفتے کے کسی دن گرینڈ اوپننگ رکھوں گا۔ مجھے ایک لیڈی مینجر کی ضرورت ہے جو گراؤنڈ فلور اور فرسٹ فلور کا کام سنبھال لے۔ لیڈیز کی سہولت کے لیے میں نے سیلز گرلز بھی رکھی ہیں جو اس کے انڈر کام کریں گی۔“

”واہ... اپنا مولوی تو بڑا رنگ رنگیلا نکلا۔ آگے پیچھے لڑکیاں ہی لڑکیاں... اوئے تیری وہ ہٹلر بیوی... اسے کوئی اعتراض نہیں؟ تو تو سانس بھی اس سے پوچھ کے لیتا ہے۔ زویا جی...! اجازت ہے؟“ میں نے اس کی نقل اتاری۔

”یہ آئیڈیا اصل میں زویا کا ہی ہے۔“ وہ برا مانے بغیر کہنے لگا۔ ”اور میں تو اپنے مال روڈ والے اسٹور پہ ہی ہوں گا۔ وائے بلاک والا اسٹور گھر کے قریب ہے۔ دن میں ایک دو بار زویا وزٹ کر لیا کرے گی اور پھر لیڈی مینجر اسی لیے تو رکھنا چاہ رہا ہوں جو سارا کام دیکھ لے۔“

اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آگیا کہ کل ناشتے کی ٹیبل حمیرا مجھے رجب کے بارے میں کیا اطلاع دینے والی تھی۔ اگرچہ اس کی بات میں نے مکمل طور پر اَن سنی کر دی تھی، لیکن اب میں تصور کر سکتا تھا کہ وہ کیا کہنے والی تھی۔

”زویا کو تو دیکھو، بزنس وومن بننے جا رہی ہے۔ کل تک ماما ماہی کے گھر فاقے کر رہی تھی، اُن کے بچوں کی اُترن پہن کے اور موٹا جھوٹا کھا کے پلنے والی کے

نصیب تو دیکھو۔ ٹھیک کہتی ہے مجاہدہ اس نے واقعی رجب بھائی پہ کوئی تعویذ کیے ہوئے ہیں ورنہ وہ اتنے مذہبی مولوی ٹائپ آدمی' کہاں بیوی کو اتنی چھوٹ دینے والے ہیں کہ وہ "دکانداریاں" کرتی پھرے۔ ایسے ہی چالاکیاں دکھا دکھا کے اصل میں یہ شوہر کی ساری جائیداد اپنے قبضے میں کرنا چاہتی ہے۔"

یقیناً یہی بیان ہوتا اس کا۔

"ویسے خاتون شریف تو ہیں؟" یہ رجب کا سوال تھا جس کا جواب نعمان نے دیا۔

"کیوں نہیں۔ ان کی شرافت کا اندازہ تم پچھلے چوبیس گھنٹوں میں آنے والے چار پیغامات سے لگا سکتے ہو۔"

"اور شریف ہو یا نہ ہو۔ پروفیشنل اور محنتی تو ہے۔ تمہیں اور کیا چاہیے۔" میں نے اس سے کہا۔

"تمہیں اپنے کام سے مطلب ہونا چاہیے جو وہ یقیناً ڈھنگ سے کر لے گی۔ دو ہی ملاقاتوں میں میں جان گیا ہوں کہ وہ پبلک ریلشنگ میں کتنی باصلاحیت ہے۔ اور شرافت کا کیا تعلق اس بات سے؟ تمہیں کیا نکاح پڑھانا ہے؟" میری اس بات پہ رجب بے چارہ اس بری طرح بدکا' جیسے میں نے اسے خودکشی کا مشورہ دے دیا ہو۔

"خدا کا خوف کرو یار۔ کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"اس میں خوفِ خدا والی کون سی بات ہے؟" اس گفتگو میں پہلی بار صدیق باجوہ نے حصہ لیا' جواب تک بڑے انہماک سے کسی اسپورٹس میگزین میں غرق تھا۔

"دوسری شادی کوئی گناہ تو نہیں۔" وہ مزید گویا ہوا۔

"تم اب تک چپ تھے۔ یہ حیرت انگیز امر تھا۔ مگر جو تم اب بولے ہو یہ اس سے بھی بڑھ کے حیرت انگیز ہے۔"

نعمان کی بات پہ وہ شانے اُچکا کے رہ گیا۔ مجھے اس کے تیور کچھ غیر معمولی لگ رہے تھے۔ دل میں کھدبد سی تو ہوئی مگر اس چکر میں پڑنے کا وقت نہیں تھا میرے پاس فی الحال تو شبانہ سے رابطہ کر کے اسے یہ خوش خبری دینا تھی کہ جتنی آمدنی اسے گھر گھر جا کے گرمی سردی میں سڑکوں پہ مارے مارے پھر کے۔ اور رکشوں کے دھکے کھاتے ہوئے حاصل ہوتی ہے۔ تقریباً اتنی ہی کا انتظام ایک ایسی باعزت جاب کے ذریعے ہو رہا ہے جہاں اسے دن کے گیارہ بجے سے لے کر رات کے دس بجے تک ڈیفنس کے سب سے پوش بلاک میں واقع سپر اسٹور کے ایئر کنڈیشنڈ ماحول میں صرف ورکرز کی نگرانی کرنا ہو گی۔ پک اینڈ ڈراپ کی سہولت کے ساتھ۔

وہ میری توقع سے بڑھ کے خوش ہوئی۔

"حیدر! آپ نہیں جانتے آپ نے میری کتنی بڑی مشکل حل کی ہے۔ یہ کام میں نے اپنے شوق سے شروع کیا تھا۔ لیکن اب میں تنگ آنے لگی تھی' اس بیگار سے' بہت چخ چخ کرنا پڑتی ہے۔ کبھی کبھی تو کیشن بھی مار لیتے تھے یہ ڈیز انٹر۔۔۔ اب ذرا ذہنی سکون کے ساتھ کام کر سکوں گی۔ آپ کا بہت بڑا احسان ہے یہ مجھ پہ۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ' دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔" میں نے اگلی ملاقات کی سبیل نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس شناسائی کو دوستی کا نام دیا۔ اس وقت ہم فون پہ بات کر رہے تھے۔

"آئندہ بھی آپ کو جب بھی میری ضرورت پڑے آنکھیں بند کر کے پکاریئے گا۔ بندہ حاضر ہو جائے گا۔"

"کیوں نہیں' ضرور۔۔۔" وہ فوراً میری خدمات حاصل کرنے پہ راضی ہو گئی۔

"مجھے تو لگتا ہے حیدر! کہ آپ وہی ہیں جس کی مجھے تلاش تھی۔"

اس کی یہ بات مجھے ہواؤں میں اڑانے لگی۔ وہ ہر مرحلہ آسان کرتی جا رہی تھی۔ نئی جاب کی خوشی میں میں نے اسے لنچ کی آفر دی۔

"اصولاً تو یہ کام مجھے کرنا چاہیے۔ مگر باہر نہیں میرے گھر پہ' آپ پرسوں یعنی اتوار کو لنچ میرے ساتھ میرے گھر میں کیجئے۔"

"آپ کے گھر۔" میں ذرا سا کھٹکا۔ پھر خود کو تسلی دی کہ گھر بلا رہی ہے تو کچھ سوچ کے ہی بلا رہی ہو گی۔ جوتے تو نہیں پڑوائے گی۔

"کون کون ہوتا ہے آپ کے گھر؟"

"زیادہ لوگ نہیں۔ بس ہم دو ہی ہوتے ہیں مگر آج کل میں اکیلی ہوں۔"

"ہم دو" سے اس کی کیا مراد ہے یہ میں سمجھ نہیں پایا مگر وضاحت اس لیے نہیں طلب کر سکا کہ میرا دل تو اس کی اگلی بات میں ہی اٹک گیا تھا۔ "میں اکیلی ہوں۔"

"یہ کم بخت اتوار پرسوں کیوں ہے؟"

☆ ☆ ☆

"کچھ سنا آپ نے؟"

گھر میں داخل ہوتے ہی حمیرا لپک کے میرے پاس آئی اور یوں میرا بازو دبوچ کے مجھے صوفے پہ بٹھاتے ہوئے کہنے لگی جیسے یہ خبر مجھے سنائے بغیر اس کی سانس اٹک رہی ہو۔

"ہاں ہاں سنا ہے۔" میں نے بے زاری سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے اس کا پھیلایا ہوا سسپنس ہوا میں اڑانا چاہا۔

"کیا سنا ہے؟" وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ آواز بھی مری مری سی نکلی تھی۔

"یہی کہ زویا کے تعویذ اثر کر گئے۔ رجب منظور ایک بار پھر اس کے پھیلائے ہوئے جال میں آ گیا ہے اور گھر کے ساتھ ساتھ اپنا کاروبار بھی اس پہ وارنے لگا ہے۔ وہ جس نے دس جماعتیں بھی پاس نہیں کیں۔ اب میم صاحب بن کے سپر اسٹور چلائے گی۔ ہے ہی بڑی چلتر۔ ایک نمبر کی فراڈ۔" میں نے اپنے تئیں حمیرا اور مجاہدہ کے دلی جذبات کی بھرپور عکاسی کی مگر اتنی کامیاب کوشش کے ردِ عمل کے طور پہ حمیرا میں ایک بار پھر ابال پیدا ہوا۔

"جی نہیں۔ یہ خبر پرانی ہو گئی۔ زویا تو پچھلے پانچ سال سے یہی کر رہی ہے۔ اب تو اگر رجب بھائی اپنی کھال کی جوتی بنوا کے بھی اس کے پیروں میں ڈلوا دیں گے تو ہم میں سے کسی کو حیرت نہیں ہو گی۔ وہ ہر حد عبور کر سکتے ہیں زن مریدی کی اور زویا میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایسا کروا بھی سکتی ہے۔ یہ بریکنگ اور شاکنگ نیوز تو صدیق بھائی کے بارے میں ہے۔"

"صدیق باجوہ؟" میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس کی کچھ حرکتیں مشکوک سی تو لگی تھیں' مگر کچھ "ذاتی وجوہ" کی بنا پہ میں ٹوہ نہ لے سکا۔ اب پتا نہیں' ان کاموں میں ضرورت سے زیادہ ٹیلنٹڈ میری بیگم کیا انکشاف کرنے والی ہیں۔

"ہاں۔" فاطمہ نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے انہیں۔ اپنی کسی طلاق یافتہ کزن سے پینگیں بڑھا رہے تھے۔

"فاطمہ بھابھی کو کیسے پتہ چلا؟" میں حیران تھا کہ جب ہمارے جیسے جگری یاروں تک کو ہوا نہ لگ سکی تو فاطمہ بھابھی جیسی اپنے آپ میں گم رہنے والی گھریلو سادی خاتون نے کیسے کھوج لگا لیا۔

"انہیں مجاہدہ نے بتایا اور مجاہدہ کو۔۔۔"

"ہاں پتہ ہے۔ رہنے دو۔" میں نے ہاتھ اٹھا کے اسے تفصیل بتانے سے روکا' مجاہدہ نے یہ سراغ کیسے لگایا۔ یہ جاننے کا مجھے خاص شوق نہ تھا۔ اس وقت تو میں اپنے ڈوبتے دل کو سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" میں بجھے دل کے ساتھ بڑبڑا رہا تھا۔

"سنبھالیں خود کو۔ میں جانتی ہوں یہ بات آپ کے لیے صدمے کا باعث بنی ہے' ظاہر ہے دوست ہے وہ آپ کا۔ ٹھہریں' میں آپ کے لیے دودھ سوڈا لائی ہوں۔" وہ تسلی دیتے ہوئے کمرے سے نکلی مگر میرے ڈوبتے دل کی تسلی کے لیے دودھ سوڈا ناکافی سہارا تھا۔ یہ صدمہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"کیسے۔۔۔؟ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟ کیسے کر سکتا ہے صدیق یہ سب میرے ساتھ؟ صدیق سے مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ مجھے یوں دھوکا دے گا۔"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو کہیں اچانک خبر نے دماغ پہ اثر تو نہیں کر دیا۔" حمیرا مشکوک انداز میں مجھے گھور

رہی تھی اس نے گلاس میرے ہاتھ میں پکڑایا۔
"یہ سارے ڈائیلاگز تو میں ابھی ابھی فاطمہ سے سن کر آرہی ہوں اور اب آپ کے منہ سے۔۔۔؟"
میں نے کچھ کہے بغیر دودھ سوڈے کا گلاس منہ سے لگالیا اب اسے کیا بتاتا کہ یہ صدمہ فاطمہ کے لیے جتنا بڑا ہے اتنا ہی میرے لیے بھی ہے۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو پارہا تھا کہ میں تو ابھی تک ڈور ہی لپیٹ رہا ہوں اور اس کی گڈی آسمانوں پہ پیچ بھی لڑانے لگی۔ میں منصوبے بناتا رہ گیا اور اس نے پریم کہانی ترتیب بھی دے ڈالی۔ مجھے جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔

☼ ☼ ☼

"تم انتہائی ذلیل انسان ہو۔" یہ میں تھا۔
"کمینے، گھنے" یہ ٹائٹل نعمان نے دیا۔
"شرم آنی چاہیے تمہیں۔" یہ احساس رجب نے دلایا۔
اسی رات کو بلائی گئی ہنگامی میٹنگ میں ہم سب صدیق پہ پل پڑے۔
"تم لوگ میرے دوست ہو، بجائے میرا ساتھ دینے کے مجھ پہ برس رہے ہو۔"
"تمہارا ساتھ؟ تمہارا ساتھ کس طرح دیں۔۔۔ یہ بھی بتادو؟ کوئی اجتماعی شادی کی تقریب رکھ لیں کیا؟ جس میں تمہارے ساتھ ساتھ ہم بھی سہرے باندھ لیں۔ اور جتنے جوتے تمہیں فاطمہ بھابھی سے پڑنے ہیں۔ اتنے ہی ہم بھی اپنی اپنی بیویوں سے کھائیں۔" نعمان کو اپنی فکر تھی۔
"تو کیا بات شادی تک پہنچ گئی۔ مگر یہ حسینہ ہے کون؟ جس نے تمہارے جیسے زاہد خشک کی قسم توڑ ڈالی۔"
"روبینہ۔۔۔ میری وہی کزن جسے میں بچپن سے چاہتا ہوں۔"
"روبینہ؟" مجھے سب یاد آگیا۔ یہ وہی تھی جس کی خاموش محبت میں وہ کئی سال مبتلا رہ چکا تھا مگر یہ وہی تو تھی جس کی طلب سے دست برداری کا اعلان صدیق نے خدا کو حاضر ناظر جان کے کیا تھا اور اپنی شادی کے ڈیڑھ برس بعد ہونے والی اس کی شادی میں کسی بھائی کی طرح کرسیاں ٹینٹ وغیرہ لگائے تھے اور بارات کے ساتھ آنے والے ایک ایک بندے کے سامنے جا کے "لڑکی والوں" کی طرح پوچھا تھا۔
"جی، آپ کو کچھ چاہیے؟ سویٹ ڈش لی آپ نے؟ روسٹ لاؤں آپ کے لیے؟"
"وہ کب طلاق یافتہ ہوئی، کب صدیق کے دل نے دوبارہ پلٹا کھایا تھا یہ معمہ تھا۔
"مگر وہ تمہارے فرمودات، وہ شادی شدہ زندگی کی بنیاد دیانت داری اور سچائی جیسے اصولوں پہ رکھنے کی باتیں، وہ وفاداری کے الاپ۔۔۔ وہ سب کیا ہوا؟"
"سب اصول مجھ اکیلے پہ تو لاگو نہیں ہوتے۔ کیا میں نے کوئی کوشش نہیں کی تھی اپنی نئی زندگی ایمان داری سے جینے کی؟ تم خود بتاؤ۔ کیا میں نے سب بھول کے فاطمہ کا ہونا نہیں چاہا تھا؟ مگر ہوا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔۔۔ اس لیے کہ صرف میری محبت، میری وفا اور میری قربانیاں اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے ناکافی ہیں۔ دوسری جانب سے بھی تو کوئی کنٹری بیوشن ہونا چاہیے۔ فاطمہ نے میری محبتوں کو اپنا حق جان کے وصولا مگر میرا حق کبھی ادا نہ کیا۔ کوئی ایک میٹھا بول۔ کوئی ایک پیار بھری نظر۔ کچھ بھی تو نہیں ہے میرے پاس۔ تیرہ سال میں نے کسی بیوی کے نہیں، ایک روبوٹ کے ساتھ گزارے ہیں۔ ایک ایسا روبوٹ جو اپنے سارے فرائض درست طریقے سے انجام دیتا ہے۔ جسے 'جو کہا جائے' وہ کرتا ہے، بس نہیں کرتا تو محبت نہیں کرتا۔ خیال نہیں کرتا، احساس نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ سب کرنے کے لیے دل کی ضرورت ہوتی ہے جو روبوٹ کے پاس نہیں ہوتا۔ فاطمہ کے پاس بھی دل نہیں ہے۔ شروع میں میں نے اسے ٹوٹ کے چاہا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی۔ ایک مثالی شوہر بن کے دکھایا۔ اس امید پہ کہ کبھی تو یہ پتھر موم ہوگا۔ کبھی تو اسے میرے پیار کی شدت کا احساس ہوگا۔ مگر یہ انتظار کب تک؟ تھک چکا ہوں میں۔ مجھے بھی کسی ہمدم، کسی دم ساز کی ضرورت ہے۔ روبینہ میری زندگی کی ساری تشنگی دور کردے گی۔"
وہ اس کے اپنے رونے تھے۔ جن میں وہ کسی حد تک حق بجانب تھا۔ فاطمہ بھابھی کتنی بھی مہمان نواز، سلیقہ مند، ذہین اور سگھڑ خاتون کیوں نہ ہوں۔ یہ بات تو ہم نے محسوس کی تھی کہ "مزاجا" وہ خاصی روکھی پھیکی اور سرد مہر تھیں اور کسی بھی مرد کو بیوی میں پہلے گرم جوشی اور محبت چاہیے ہوتی ہے بعد میں اس کے ہاتھ کا ذائقہ، نعمان نے اس سے اختلاف کرنے کی اپنی سی کوشش کی، جسے صدیق نے رد کردیا۔
"تم نہیں سمجھو گے یہ مجاہدہ بھابھی کی بے پناہ محبت ہی ہے جو وہ تم پہ شک کرنے اور تم پہ پہرے بٹھانے پہ مجبور ہیں۔ یہ محبت ہی اس ڈر کی وجہ ہے کہ کہیں تم ان کی بجائے کسی اور کے نہ ہو جاؤ۔ ارے یار اس رشتے کی تو اساس ہی محبت ہے۔"
وہ اپنی ہٹ کا پکا تھا، رجب کا سمجھانا، میرا ڈرانا سب بے کار گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا۔۔۔ کیا ہوا آپ کو؟ آپ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں؟" میرے سر پہ بم پھوڑنے کے بعد اب وہ محترمہ معصومہ بنی میری حیرت کی وجہ دریافت کر رہی تھیں۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی جس پہ جتنا حیران ہوا جاتا کم تھا۔ اس تیسری ملاقات میں میں اس کے گھر پک کرنے آیا تھا اور وہ چھوٹتے ہی مجھ سے شادی کی بات۔۔۔
"میں نے کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں کردی۔" وہ کچھ نادم سی نظر آئی۔
"صرف ایک پیشکش کی ہے۔ اگر آپ کو منظور نہیں تو نہ سہی۔ کوئی زبردستی تھوڑا ہی ہے۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز کپکپائی تھی۔ شاید بہت ہمت کر کے یہ بات کہنے کے بعد وہ خود شرمندہ ہو رہی تھی کہ اس نے یہ کیا کہہ دیا۔
"اگر آپ اس پوزیشن میں نہیں تو اپنے اردگرد کہیں اور کوئی رشتہ۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کا کوئی دوست، کزن۔۔۔" وہ انگلیاں موڑتے ہوئے کہتی بہت بکھری بکھری سی لگ رہی تھی۔ مجھے یکدم اس پہ بے حد ترس آیا۔ پتہ نہیں کیا مجبوری ہے۔ اس بے چاری کو جو وہ خود کو اتنا ارزاں کر رہی ہے۔
"آپ مجھے اچھے انسان لگے تھے اور صاحب حیثیت بھی۔ میرا خیال تھا آپ آسانی سے دو بیویاں افورڈ کر سکتے ہوں گے اس لیے ایسا کہہ دیا لیکن اگر آپ کو برا لگا ہو تو میں معذرت چاہتی ہوں۔ آپ پلیز! میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ نکالیے گا۔"
اور غلط مطلب تو میں ضرور نکالتا اگر اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو مجھے اتنے سچے نہ لگ رہے ہوتے۔ میں نے اس سے پہلے کسی عورت کو بے بسی اور کشمکش کی اس انتہا پہ نہیں دیکھا تھا۔ جہاں اس وقت مجھے شبانہ نظر آرہی تھی۔ میں اس سے وجہ جاننا چاہتا تھا۔ کہ آخر ایسی کیا مجبوری ہے جو وہ مجھ سے۔۔۔ ٹھہریں، میں آپ کو شروع سے ساری بات بتاتا ہوں۔
یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ مجھے آج لنچ کے لیے شبانہ کے گھر جانا تھا۔ صبح سے ہی میں تیاریوں میں جتا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کی دونوں ملاقاتوں میں میں اس سے بڑے نارمل ڈریس میں ملا تھا یعنی سوٹ میں۔۔۔ آج میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں کس قدر جامہ زیب انسان ہوں اور مجھ پہ کرتا شلوار بھی اتنا ہی جچتا ہے جتنا کہ ٹو پیس سوٹ، رگڑ رگڑ کر شیو کرنے کے بعد میں نے اپنے کھرچے ہوئے چہرے پہ آفٹر شیو لگایا۔ رات کو چوری چوری میں فیشل بھی کروا کے آیا تھا۔ رنگ خاصا نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اور اسکن تر و تازہ، رات کو تو حمیرا نے غور نہ کیا۔ مگر صبح ضرور اسے کوئی خاص تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ اسی لیے بار بار کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر ایک لفظ تعریف کا نہ کہا۔ یہ تک نہ کہا کہ آج تم بڑے نکھرے ہوئے لگ رہے ہو۔ ہے نا بیوی۔۔۔
سفید باریک دھاریوں والا کرتا۔ لٹھے کی

کھڑکھڑاتی سفید شلوار۔ پشاوری چپل، لباس خوشبو میں بھیگا ہوا۔ بال جیل سے سمٹے ہوئے۔ ہاتھ میں اپنا نیا قیمتی سیل فون تھامے میں گاڑی کی طرف بڑھا۔

"سنیں۔" یہ حمیرا کی آواز تھی۔ اس نے ایک اور بیویوں والی حرکت کی تھی۔ یعنی پیچھے سے آواز دی تھی۔ میں بدمزا ہوا۔

"کیا ہے؟" کاٹ کھانے والے انداز میں، میں دھاڑا۔

"آج آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔" مٹھی بند کر کے اس نے میرے سر پہ بلند کی۔ میں بچاؤ کے لیے جھک گیا۔

"تو کیا اچھا لگنے کی پاداش میں تم مجھے مکے مارو گی؟" سخت متوحش انداز میں دونوں ہاتھ آگے کر کے اس کا وار روکتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"نہیں بھی، ہر وقت مذاق۔۔۔ یہ تو میں مرچیں وار رہی ہوں تاکہ نظر نہ لگ جائے کسی کی۔" میں غور سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ واحد حرکت تھی جو بیویوں والی نہیں تھی۔ اور میری بیوی کر رہی تھی۔

"چھ۔۔۔ سات۔۔۔" اب یہ میں چولہے میں جھونکوں گی، تاکہ ساری بری بلائیں دور ہو جائیں۔"

"ایک آدھ بچی رہے تو کیا حرج ہے؟" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ شبانہ اقبال ٹاؤن میں واقع گنجان علاقے کی ایک بلڈنگ کے تھرڈ فلور پہ واقع فلیٹ میں رہتی تھی۔ میں نے ایک عدد آئس کریم کیک، ایک بڑا ساہو کے اور کچھ پھل بھی خرید لیے۔ دراصل مجھے اس سے پہلے یہ تجربہ نہ تھا کہ کسی "لڑکی" سے اس کے گھر پہلی دفعہ ملنے کے لیے جاتے ہوئے کیا لے کر جانا چاہیے۔ شبانہ میری آمد سے خوش تو نظر آ ہی رہی تھی۔ مگر صاف لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا بھی چاہتی ہے۔ یہی حالت میری بھی تھی۔ کھانا اس نے واقعی لذیذ تیار کیا تھا۔ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے آخر کار اس نے ہمت کر کے وہ بات کر ہی دی جس نے میرے چودہ طبق روشن کر کے رکھ دیے۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"کیا۔۔۔؟" مجھے لگا، شاید مجھ سے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

"حیدر! کیا آپ میری بیٹی سے شادی کریں گے؟" اس نے اپنا سوال ایک بار پھر دوہرایا۔

"بہت پیاری ہے وہ۔ آج کل ہاسٹل میں ہوتی ہے، کم از کم وہاں محفوظ ہی ہے۔ میں سارا دن گھر پہ نہیں ہوتی اور جوان لڑکی۔۔۔ یہ علاقہ۔۔۔ اس لیے میں نے اسے ہاسٹل میں داخل کرا دیا ہے۔ بی ایس سی کے فائنل ایئر میں ہے۔ انیس سال کی ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوش شکل، باادب اور سادہ مزاج کی ہے۔ آپ کو بہت خوش رکھے گی۔"

"آپ۔۔۔ آپ کس قسم کی گفتگو کر رہی ہیں؟" میرا انداز کچھ سخت ہوا تو وہ بجھ کے رہ گئی۔

"آپ مجھے اچھے انسان لگے تھے اور صاحب حیثیت بھی۔ میرا خیال تھا آپ آسانی سے دو بیویاں۔۔۔" اب وہ وضاحت پیش کر رہی تھی۔

"اگر آپ کو برا لگا ہو تو میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ پلیز میری بات کا کوئی غلط مطلب۔۔۔" وہ اب معذرت کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اگر آپ خود نہیں تو اپنے اردگرد کہیں اور کوئی رشتہ۔۔۔" ایک نئی ڈیمانڈ۔

میرا سر چکرا گیا جسے میں نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"کیا ہوا حیدر۔۔۔؟" وہ جلدی سے پانی لے آئی۔

"پہلے آپ مجھے بتائیے یہ قصہ کیا ہے؟ آپ مجھے ڈھنگ سے جانتی نہیں اور چلی ہیں اپنی بیٹی کا رشتہ دینے اور وہ بھی انیس سال کی خوبصورت بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ بیٹی کا۔ یہ چکر کیا ہے؟ میں کوئی غلط مطلب نکالنا تو نہیں چاہتا لیکن اگر آپ نے اصل بات نہ بتائی تو مجبوراً مجھے وہی مطلب درست ماننا پڑے گا جو ان حالات میں نکالا جا سکتا ہے۔"

"نہیں نہیں حیدر! میں ایک باعزت گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ آج حالات کی سختی کی وجہ سے گھر سے نکلنا پڑا ہے ورنہ لڑکپن اور کنوارپن سخت پردے میں گزرا۔ میری شادی کم عمری میں ہو گئی تھی اس لیے تعلیم بھی مکمل نہ کر پائی۔ بیوہ بھی کم عمری میں ہی ہو گئی۔ ثمو صرف چھ سال کی تھی اور میں صرف پچیس سال کی۔ میرا میکہ تو رہا نہیں۔۔۔ میں اکلوتی تھی اور ماں باپ مجھے بیاہتے ہی گزر چکے تھے۔ کہنے کو چچا، تایا بھی سب تھے، مگر کسی نے مجھ یتیم اور بیوہ بے سہارا لڑکی کے سر پہ ہاتھ نہ رکھا۔ میں نے سسرال میں پناہ تلاش کرنا چاہی، ساس کی زندگی تک دو سال جیسے تیسے گزار لیے، بعد میں جیٹھانیوں، دیورانیوں نے اکا کر کے نکال دیا۔ مت پوچھیے کہ کہاں کہاں ہاتھ پھیلایا۔ کس کس در سے ناامید ہوئی۔ سب اپنے تھے مگر مشکل وقت میں بیگانے بن گئے تھے۔ تب میں نے ہمت کر کے اپنے بل بوتے پہ زندہ رہنا چاہا۔ ایک جوان بیوہ اور بے سہارا بھی۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں راستے میں کیا کیا مشکلیں نہ آئی ہوں گی۔ کتنے درندوں نے جھپٹنا چاہا ہو گا۔ میری راہ کھوٹی کرنے کے لیے کیا کیا ترغیب دی ہو گی۔ وہ راستہ جو دنیا میرے سامنے پیش کر رہی تھی وہ بہت آسان تھا۔ اس راستے پہ چل کے میں آسانی سے اپنا اور اپنی بیٹی کا بندوبست کر سکتی تھی۔ مگر میں جانتی تھی کہ حرام کیا ہے، حلال کیا ہے۔ مجبوری کے عالم میں پردہ ترک کر کے گھر سے نکلنا، زمانے کے طور طریقوں سے نباہ کرتے ہوئے ظاہری طور پہ پرکشش نظر آنے کی کوشش کرنا۔ ایک الگ بات ہے لیکن میں نے ہر طرح سے خود کو بچا کے رکھا۔ میری تنگ دستی، میری شرافت کی گواہ ہے۔ اگر میں حرام حلال کی تمیز کیے بغیر کماتی تو آج راستے میں ملنے والے اجنبیوں سے نوکری کی درخواستیں نہ کر رہی ہوتی۔"

"میں مانتا ہوں، اتنی پرکھ تو ہے مجھ میں۔ آپ واقعی ایک باعزت خاتون ہیں، مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یکایک اپنی کم عمر بیٹی کو ایک شادی شدہ بال بچے دار آدمی سے بیاہنے پہ کیوں تل گئی ہیں؟"

"میرے ماں باپ نہیں تھے، مگر چچا تھے، جن کے سہارے پہ میں نے بچپن گزارا تھا۔ ماموں تھے جو بھی میری ہر فرمائش پوری کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔ پھوپھیاں تھیں جو جان سے عزیز رکھتی تھیں، لیکن مشکل گھڑی میں ان سب نے آنکھیں پھیر لیں جب کہ ثمو کی تو نہ کوئی سگی خالہ ہے نہ ماموں، ہاں چچا تایا ہیں مگر پچھلے تیرہ سالوں میں انہوں نے مڑ کے اس کی خیریت دریافت نہیں کی۔ کوئی رابطہ ہی نہیں ہے۔ ڈرتی ہوں کل اچانک میری آنکھیں بند ہو گئیں تو ثمو کا کیا ہو گا، کون سہارا دے گا اسے؟ کیا اسے بھی میری طرح ایک طویل اور کڑی جنگ لڑنا ہو گی۔ بھوک اور ذلت کے خلاف؟ میرے شوہر اچھے بھلے تھے، بالکل تندرست، تمیں سے ایک آدھ سال اوپر کے ہوں گے۔ صبح گھر سے نکلے اور شام کو ان کی لاش گھر آئی۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

ہر وقت ثمو کی فکر لاحق رہتی ہے۔ میرے پاس نہ زیور ہے نہ کوئی جمع کی ہوئی رقم۔۔۔ کہ اچھا رشتہ ڈھونڈ لوں۔ خاندان والے پوچھتے تک نہیں، بیٹی کیا لیں گے۔ اس لیے خود ہی کوشش کر کے دیکھنا چاہا کہ شاید بیٹی کا گھر بسا لوں۔ میرا خیال تھا کہ کوئی کم عمر لڑکا جو ابھی خود اپنے پیروں پہ کھڑا نہ ہو، اس سے بہتر ہے کسی مضبوط حیثیت والے شخص کو اپنا داماد بناؤں۔" رنڈوا، طلاق یافتہ ہو یا بے شک کوئی جسمانی عیب ہو۔ جو میری بیٹی کی قدر کرے اسے تحفظ دے۔"

میرے سامنے وہ عورت بیٹھی رو رہی تھی، جس کے بارے میں کل تک میں بڑے دل نشین خواب دیکھ رہا تھا۔ آج وہ مجھے ایک مجبور ماں سے زیادہ کچھ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے آنسو مجھے شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل رہے ہیں۔

"آپ کی خاموشی یہ ثابت کر رہی ہے حیدر! کہ میرا فیصلہ غلط ہے۔۔۔ نہ صرف فیصلہ بلکہ طریقہ بھی۔ پتا نہیں آپ مجھے کس قماش کی عورت سمجھ رہے ہوں گے۔"

میں اسے روتا چھوڑ کے چپکے سے باہر نکل آیا۔ مجھ میں اب اپنا سامنا کرنے تک کی ہمت نہ تھی۔ کاش کہ میں کچھ دیر کے لیے اپنے آپ سے بھی الگ ہو پاتا۔

گھر آتے ہی حمیرا کو سراسیمہ سی حالت میں بچوں سمیت گھر سے نکلتے دیکھا' وہ بیرونی دروازے کو تالا لگا رہی تھی۔

"میں نے تو کچھ کیا بھی نہیں۔" اس بار بھی معجزاتی طور پہ میری شرافت برقرار رہی۔ "پھر یہ گھر چھوڑ کے کیوں جا رہی ہے۔ اور یہ آنسو۔ یہ گھبراہٹ۔" میں گاڑی اسٹارٹ چھوڑ کے اس کی جانب لپکا۔

"حیدر! آپ آ گئے۔ شکر ہے۔ موبائل کیوں آف تھا آپ کا؟ میں کب سے ٹرائی کر رہی ہوں۔"

"ہوا کیا ہے؟ بچے لے کر کہاں جا رہی ہو؟"

"انہیں امی کی طرف چھوڑ کے ہاسپٹل جا رہی تھی۔ مجاہدہ کا فون آیا ہے۔ فاطمہ کی حالت بہت سیریس ہے۔ اس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔"

☼ ☼ ☼

آئی سی یو کے دروازے سے لگا بے آواز آنسو بہاتا وہ صدیق باجوہ تھا۔ میں نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

"میں نہیں جانتا تھا وہ مجھے اتنا چاہتی ہے۔ مجھے کسی کے ساتھ شیئر کرنے سے مر جانا زیادہ بہتر سمجھتی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا ورنہ۔۔۔ ورنہ ایسا سوچتا بھی نہ۔۔۔ میرا تو خیال تھا اسے میری پروا ہی نہیں ہے۔"

"یار! یہ عورت چیز ہی ایسی ہے۔ سمجھنا چاہو بھی تو سمجھ میں نہیں آتی۔ اور اس کی محبت۔۔۔ وہ تو خیر ہے ہی ناقابلِ یقین حد تک گنجلک چیز۔ جو محبت کرتی ہے اس کی محبت ہمیں نظر نہیں آتی اور جہاں نظر آنے لگتی ہے وہاں اصل میں ہوتی ہی نہیں۔" آج فلسفہ بگھارنے کا میرا پورا پورا حق بنتا تھا۔ زندگی نے سبق ہی ایسا سکھایا تھا۔

"ٹھیک کہتے ہو' روبینہ تو ایک سراب تھی۔ ایک خوش نما سراب۔ جو کبھی ہاتھ نہیں آ سکتا۔ یہ میری کم فہمی تھی جو میں اس کا مقابلہ فاطمہ سے کرنے چلا تھا۔ جس نے ان تیرہ سالوں میں مجھے کیا نہیں دیا۔

پیارے پیارے بچے۔ پرسکون گھر۔ اور کیا رہا اس کی وفا اور محبت کا ثبوت؟ تو آج وہ بھی مل گیا۔ مگر یہ ثبوت مجھے بہت مہنگا پڑ رہا ہے حیدر! خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا۔۔۔ میرے بچے۔ ایک عورت بن باپ کے بچے پھر بھی کسی نہ کسی طرح پال لیتی ہے حالانکہ وہ کتنی کمزور ہوتی ہے مگر مرد اختیار رکھتے ہوئے بھی بن ماں کے بچے نہیں پال سکتا۔ یہ ذمہ داری تن تنہا نہیں اٹھا سکتا۔"

میری آنکھوں کے آگے پھر سے روتی ہوئی شبانہ آ گئی۔ ایک بن باپ کی بچی کی مجبور سہمی ہوئی ماں۔ جو اس کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ الٹی سیدھی کوششیں کر رہی تھی۔

"تم بہت سنجیدہ ہو؟" اکیلے میں رجب نے پوچھا۔

"بس وہ۔۔۔ فاطمہ بھابھی کی کنڈیشن۔۔۔ صدیق کی پریشانی۔" میں نے جواز تراشے۔

"نہیں' کوئی اور بات بھی ہے۔"

تب میں نے اسے شبانہ کے گھر والا واقعہ سنا دیا۔ وہ خاصا نرم دل تھا' بالکل ہی پگھل کے رہ گیا۔

"مجبوری انسان سے کیا کچھ نہیں کراتی۔ اب تو تم سفارش نہ بھی کرو تو یہ جاب میں اسے ہی دوں گا۔ زویا سے کہوں گا کہیں رشتہ دیکھے۔"

"میرا والا قصہ نہ سنا دینا کہیں۔ تمہیں تو پتا ہی ہے' ان چاروں کا۔ کوئی بات راز نہیں رکھ پاتیں۔"

"تم فکر مت کرو۔"

خدا کا شکر ہے کہ صدیق کی دعائیں رنگ لائیں اور فاطمہ بھابھی زندگی کی طرف لوٹ آئیں۔ انہیں واپس لانے میں وہ سارے وعدے اور قسمیں بہت معاون ثابت ہوئے جو صدیق نے ان کا ہاتھ تھام کے روتے ہوئے کیے تھے۔

یہ تلخ واقعہ ان کے لیے تجدیدِ محبت کا باعث بنا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج مہینے کا آخری اتوار ہے۔

اور حسبِ روایت ہم سب کسی ایک کے گھر اکٹھے ہوئے ہیں اور وہ گھر اس بار رجب منظور کا ہے۔

بہت کچھ پہلے جیسا ہے۔

وہی ہم سب کا کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہو کے سگریٹ' چائے اور ڈینگوں کا مقابلہ کرنا۔

وہی ہماری بیگمات کا لاؤنج میں بیٹھ کے کھسر پھسر کرنا۔

اور ہمارے بچوں کا باجماعت بیٹھ کے کارٹون نیٹ ورک دیکھنا۔

لیکن بہت کچھ ایسا بھی ہے جو نیا ہے' جو پہلے کبھی نہیں تھا۔ ایک تو یہ کہ آج ہماری نظروں میں رجب منظور کے لیے تمسخرانہ ہمدردی نہ تھی' بلکہ رشک تھا۔

اور دوسرے یہ کہ ہماری بیگمات کی نظروں میں بھی زویا کا مقام بدل چکا تھا۔ اب وہ اسے عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ میری بیوی حمیرا کی رائے یکسر بدل چکی ہے۔ پہلے اس کے نزدیک زویا ایک چالباز عورت تھی' جسے مرد کو دبا کے رکھنے کا فن آتا تھا۔ لیکن اب اس کا خیال ہے کہ زویا وفا کی پتلی' ایثار کی دیوی ہے۔ اور تو اور مجاہدہ کی رائے بھی وہ نہیں رہی۔ پہلے اسے شک تھا کہ اس نے تعویذ گنڈوں کے ذریعے مولوی رجب کو قابو میں کر رکھا ہے اور اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ مولوی رجب نے ہی الٹی سیدھی دوائیاں کھلا کے بھولی بھالی زویا کا دماغی توازن خراب کر دیا ہے۔

ایک بڑی تبدیلی یہ بھی تھی کہ ہم چاروں اب تک چار ہی تھے وہی چار۔۔۔ میں' حیدر مجید' نعمان علی' رجب منظور اور صدیق باجوہ۔

مگر ان چاروں میں ایک اور کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اب وہ پانچ ہیں۔ حمیرا یعنی مسز حیدر۔۔۔ مجاہدہ یعنی مسز نعمان۔۔۔ فاطمہ یعنی مسز صدیق۔۔۔ زویا یعنی مسز رجب۔۔۔ اور ثمرہ۔۔۔ وہ بھی مسز رجب منظور ہے ناکمال کی بات۔

رجب منظور کی یہ شادی خود زویا نے کرائی ہے اس کی کم عمر' حسین اور خوش مزاج ہنس مکھ بیوی نے۔۔۔ جس کے آگے دم مارنے کی اس کی مجال نہ تھی۔ وہی زویا۔۔۔ جس کے بارے میں سب کی متفقہ رائے تھی کہ اس نے اپنے شوہر کو پٹہ ڈال رکھا ہے۔

جب میں نے رجب کو اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتایا تھا تو یہ تاکید بھی کی تھی کہ اس کی خبر اپنی بیوی کو نہ ہونے دینا ورنہ میرا مذاق بن جائے گا اور حمیرا بھی چوکنا ہو جائے گی۔ مگر اس نے بھی زویا کو ہم راز بنا کے دم لیا۔ بقول اس کے زویا یہ سارا واقعہ سن کے گم صم سی ہو گئی تھی۔ اس کے اگلے ہی دن جب شبانہ اس سے ملنے آئی تھی تو زویا نے اسے ملازمت پہ رکھ لیا تھا۔ اپنی عادت سے مجبور وہ کچھ ہی دن بعد زویا سے ثمو کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کر رہی تھی اور اس سے کوئی معقول رشتہ تلاش کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ رشتہ تو کہیں اور۔۔۔ کوئی سا بھی تلاش کیا جا سکتا تھا اگر واقعی زویا کو شبانہ اور اس کی بیٹی ثمو سے ہمدردی کا بخار اٹھ رہا تھا تو۔۔۔ پھر آخر رجب ہی کیوں؟

زویا نے پتہ نہیں کیا دلائل دے کر اسے راضی کیا ہو گا' ورنہ وہ تو زویا کے علاوہ کسی اور کو دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ یہی وجہ تھی جو ہم تینوں دوست اس پہ رشک کر کر کے بے حال ہو رہے تھے۔

یک نہ شد دو' دو شد۔۔۔

ایک چوبیس سالہ' اور ایک انیس سالہ حسین بیوی۔

اب رجب کی چاہے خواہش ہو یا نہ ہو مگر اسے دو دو حوریں اس دنیا میں ہی مل گئی تھیں۔ اور اس کے لیے بھی وہ خدا کے بعد زویا کا ہی شکر گزار تھا۔

"تم نہیں جانتے حیدر! وہ کتنی عظیم لڑکی ہے' کہتی ہے کہ میرے پاس آج جو ہے وہ میری اوقات اور میری طلب سے بہت زیادہ ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو اللہ نے جو اتنا زیادہ نوازا ہے' وہ میرے علاوہ کسی اور کے نصیب کا بھی ہو۔ آپ اسے سہارا دے دیں' ثواب کا کام ہے۔ آپ کے ثواب میں میں بھی حصہ دار بن جاؤں گی۔"

وہ عقیدت سے چور چور لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مگر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اصل بات کچھ اور ہے۔

میں نے یہ اصل بات جاننے کے لیے وہی کیا جو پچھلی ایسی گید رنگ میں کیا تھا' یعنی پردہ اٹھا کے "جھاتی" ماری۔ خواتین کی محفل ختم ہونے کے قریب تھی۔ نمو چائے کے برتن اٹھا کے لیے جا رہی تھی۔ مجاہدہ اس کی مدد کرنے لگی۔ اندر سے میرے بیٹے کی چیخ کی آواز پہ حمیرا سامنے والے کمرے میں چلی گئی۔ اب صوفے پہ فاطمہ اور زوبیا بیٹھی تھیں۔ بچوں والے کمرے سے رجب اور زوبیا کی ایک سالہ بچی گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے لاؤنج میں آئی۔ زوبیا نے لپک کے اپنی اکلوتی بیٹی کو گود میں لے لیا۔ فاطمہ بھابھی مسکراتی نظروں سے ماں بیٹی کے والہانہ انداز دیکھ رہی تھیں۔

"تم نے بہت بروقت اور درست فیصلہ کیا ہے زوبیا! اس سے پہلے کہ مزید اولاد کی تڑپ یا نرینہ اولاد کی طلب رجب بھائی کو خود کوئی قدم اٹھانے پہ مجبور کرتی' تم نے یہ فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے کر نہ صرف انہیں اپنی محبت کے سحر میں جکڑ لیا ہے بلکہ یہ لڑکی بھی تم سے دب کے رہے گی' تمہاری احسان مند ہو کے۔"

"میں کسی کو احسان تلے دبا کے نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میرے شوہر نے جس طرح مجھے محبت' عزت' مان اور تحفظ دیا ہے میں بھی اسے کچھ نہ کچھ دوں۔ مگر میں تو ایک صحت مند اولاد تک دینے کے قابل نہیں۔"

اچانک میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ رجب کی یہ بچی جو شادی کے چار سال بعد پیدا ہوئی تھی پیدائشی اندھی تھی۔

"ڈاکٹرز صاف صاف کہہ چکے تھے میری ہر اولاد میں نابینا پن کے نوے فیصد چانسز ہیں۔ ایسے میں' میں..." اس کی آواز بھیگ گئی۔

میں نے چپکے سے پردہ گرا دیا اور ایسا کرتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا کہ سامنے والے کمرے سے نکلتی حمیرا رک کے نہ صرف ان کی بات سن رہی تھی' بلکہ اس کے چہرے کی رنگت بھی متغیر ہو رہی تھی۔

"اللہ ہی بچائے اب حمیرا سے انہیں۔ یہ اور مجاہدہ کو کچھ نہ بتائے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا اور مجاہدہ کو بتانے کا مطلب ہے سارے شہر کو بتانا۔"

واپسی پہ سارے رستے میں منتظر رہا کب وہ بات کرتی ہے' کب زوبیا کی فراخ دلی کا بھانڈا پھوڑتی ہے۔ اور بالآخر وہ بول اٹھی۔

"میں جانتی ہوں آپ کو چھپ کے باتیں سننے کی عادت ہے۔" اس نے مجھے چونکا دیا۔

"مگر یہ عادت صرف سننے تک محدود رہے تو بہتر ہے۔ آج آپ کو جو کچھ بھی زوبیا کے بارے میں پتا چلا' اگر آپ رجب بھائی کو نہ بتائیں تو بہت بڑی نیکی کریں گے۔ اس بے چاری کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ ابھی تو شوہر احسان مند ہے' اسے ایک فرشتہ سمجھ کے پوج رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کل کو اسے جھوٹا اور خود غرض گردانتے ہوئے نئی بیوی کا ہو کے رہ جائے۔ پلیز! آپ ایسا مت کیجئے گا... مت بتائیے گا انہیں۔ مرد ذات کا کوئی بھروسہ ہے بھلا۔"

میں گاڑی روک کے چپ چاپ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"اور عورت ذات کا بھی کوئی بھروسہ ہے بھلا... کب کیا کر جائے..." میں مسکرا دیا۔

"کیا مطلب...؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کار دوبارہ اسٹارٹ کی۔

یہ سچ ہے کہ شوہروں اور وہ بھی شریف شوہروں کی ننانوے اقسام ہوتی ہیں۔

مگر یہ بھی سچ ہے کہ بیویوں کی ننانوے ہزار اقسام ہوتی ہیں اور ان ننانوے ہزار قسم کی بیویوں میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے اور وہ یہ کہ یہ سب کی سب "ناقابل فہم" ہوتی ہیں۔

✻